حیاتِ سعدی

یعنی

شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور
اُن کی تمام نظم و نثر پر جدا جدا ریویو

مرتبۂ

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

مصححۂ

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری زینبی

منشی محمد اسمٰعیل صاحب منیجر کے اہتمام سے

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد سے چھپکر شائع ہوئی

۱ جلد	قیمت فی جلد عہ

رباعیات عمر خیام

معہ

مقدمہ و شرح و ترجمۂ اردو

مشرحہ

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری زینبی

مدرس عربی و فارسی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد

مقدمہ میں حکیم عمر خیام کے حالات اور اُن کی رُباعیوں کی خصوصیات اور باعتبار مضامین کے اُس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں مقدمہ کے بعد ہر رُباعی کے نیچے اُس کا ترجمہ اور شرح لکھ دی گئی ہے۔ اسی تقطیع پر سفید چکنے دبیز کاغذ پر نہایت خوشخط چھاپکر تیار ہے۔ قیمت فی جلد عہ ر

ملنے کا پتہ

مینجر انوار احمدی پریس

الہ آباد

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱
پہلا حصہ	۲
...ں اور شیراز کا حال۔	۹
...کے بچپن کا حال۔	۱۰
...کی تعلیم کا حال۔	۱۱
...کی سیاحت کا حال۔	۲۵
...سے وطن میں آنے اور شیراز میں آنے کا حال۔	۳۴
...کی وفات اور اُس کے دفن کا حال	
دوسرا حصہ	
...کی شاعری کی شہرت اُس کی زندگی میں	۵۳
...کے کلام پر لوگوں کی رائیں۔	۵۷
...اور شکسپیر کے کلام میں مماثلت۔	۶۳
...ت شیخ کی تفصیل۔	۶۴
...تاں اور بوستاں۔	۶۶
...دں کتابوں کی اجمالی تعریف۔	
...تاں کی ترجیح بوستاں پر	
...ہنامہ مثنوی معنوی گلستاں و...	
دیوانِ حافظ کا ذکر۔	
...وں کتابوں کی شہرت اور مقبولیت کے جداگانہ اسباب۔	
...ستاں کے ترجمے اور شرحیں اور ترتیب	

مضمون	صفحہ
کا ذکر۔	
اُس بات کی وجہ کہ گلستاں بہت غور و فکر سے ایک مدت دراز میں لکھی گئی ہے۔	
گلستاں کی ترجیح تمام اگلی اور پچھلی نثروں پر اور مقاماتِ بدیعی تا بوس نامہ تاریخ وصّاف کا ذکر۔	
تین کتابوں کا ذکر جو گلستاں کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔	۴۲
گلستاں اور بہارستانِ جامی کا مقابلہ۔	۸۵
گلستاں اور خارستاں کا مقابلہ۔	۸۸
گلستاں اور پریشاں کا مقابلہ۔	۹۴
گلستاں کے اشعار اور فقرے جو ضرب المثل ہو گئے ہیں۔	۹۷
بوستاں	۱۰۳
بوستاں اور شاہنامہ کا موازنہ۔	۱۰۵
بوستاں اور سکندر نامہ کا موازنہ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کے ساتھ۔	
بوستاں اور سکندر نامہ کا مقابلہ۔	۱۱۱
بوستاں اور غزلیات شیخ علی حزین کا مقابلہ	۱۱۳
گلستاں و بوستاں کی وہ خاصیتیں اور خوبیاں جن کے سبب سے دونوں کتابیں مقبول عام و خاص ہوئی ہیں	۱۱۷

عنوان	صفحہ
غزلیات شیخ	۱۵۰
قدما کی غزل پر شیخ کی غزل کی ترجیح کے وجوہ۔	۱۵۲
شیخ کی غزل کی وہ خصوصیتیں جو قدما کی غزل میں بہت کم پائی جاتی ہیں	
شیخ کی غزلیات کے نمونے۔	۱۶۰
شیخ اور قدما کی غزل میں باریک فرق۔	
شیخ اور اس کے متبعین کی غزل سے سوسائٹی پر کیا اثر ہوا۔	
قصائد وغیرہ	۱۷۱
شیخ سے پہلے مسلمانوں میں قصیدہ گوئی کا کیا حال تھا۔	
شیخ اور قدما کے قصیدے میں تفاوت کی وجہ۔	
شیخ قصیدہ کس غرض سے لکھتا تھا۔	
جو غرض قصیدے سے ہونی چاہیے وہ قدما کے قصیدے سے حاصل نہیں ہوتی۔	
قصائد شیخ کے اشعار بطور نمونہ کے	
مجموعہ صاحبیہ کے اشعار بطور نمونہ کے	۱۷۳
مطائبات وہزلیات ومضحکات پر ریویو۔	۱۹۲
قصائد عربیہ کا ذکر۔	۱۹۶
مرثیہ بغداد کے اشعار۔	۱۹۶
خاتمہ	
شیخ کے حالات اور اس کی عام شاعری پر اجمالی نظر۔	۲۰۴
شیخ کے قوائے جسمانی اور مذہب کا ذکر۔	۲۰۴
شیخ کے صوفی واعظ اور شاعر ہونے کا ذکر۔	
شیخ کی خصلتیں۔	
شیخ کے کمال شاعری اور سنجیدگی خیالات کے اسباب۔	
شیخ کو اور شعرا پر ترجیح دینے کے وجوہ	
ایران میں جو امردوں کے عشق پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کے متعلق مصنف کی رائے۔	

ہیں۔ جابجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں صحراے شاپور میں جو کہ شیراز کے نواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے۔ جسکا نام شِعْب بَوّان ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفریح گاہیں ایسی ہیں جن کا کہیں نظیر نہیں۔ صُغدِ سمرقند۔ غُوطۂ دمشق نہرِ اُبُلّہ اور شِعْبِ بَوّان +

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جس کے عہدِ حکومت میں شیخ نے گلستاں لکھی ہے ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں خوف کی حالت میں قلعۂ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہِ شعب بوان۔ اکثر شعراے عرب نے اس قطعہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضد الدولہ دیلمی کی فرمایش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

إِذَا أَشْرَفَ الْمَحْزُوْنُ مِنْ رَأْسِ تَلْعَةٍ عَلَىٰ شِعْبِ بَوَّانٍ اسْتَرَاحَ مِنَ الْكَرْبِ

ترجمہ۔ جب غمگین کوہی قلعہ پر سے شعب بوان کی فضا کو دیکھتا ہے تو اُسکی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں

فارس کے میوے عراقِ عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے اور سفید کانیں فارس میں موجود ہیں۔ فارس کے آثارِ قدیمہ دنیا کے ان عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانے کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے جیسے تختِ جمشید۔ نقشِ شاپور۔ دخمہ فریدوں۔ اور خانۂ زردشت ان کا مفصل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں کو ہے

سلہ صُغد معرب سُغد نشیب کی زمین اور صُغدِ سمرقند ایک نزہت گاہ سمرقند کے قریب تھی غوطہ بھی کہتے ہیں۔ غوطۂ دمشق ایک سیرگاہ دمشق میں تھی۔ اُبُلّہ بصرہ میں ایک پرفضا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی اس کو نہرِ ابلہ کہتے تھے یہ تینوں مقام اور شعب بوان دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے

مذکور ہے اِنھیں آثارِ قدیمہ کی نسبت عُرفی شیرازی نے کہا ہے ؎

از نقش و نگار در و دیوارِ شکستہ — آثار پدید است صنادیدِ عجم را

اسکے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ
میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز
سمجھے گئے ہیں۔ جیسے کہ یزد۔ میبذ۔ گازرون۔ فیروزآباد۔ بیضا۔ شیراز وغیرہ۔ ان شہروں
میں کثرت سے علما و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں
میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایۂ تخت رہا ہے
مُسلمان ایرانیوں نے جس طرح قُم کو دار المومنین اور یزد کو دار العبادۃ کا خطاب
دیا ہے اسی طرح شیراز کو دار العلم کے لقب سے مُلقّب کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و
فضل زمانے کے انقلاب اور سلطنت اسلامیّہ کے تنزّل سے اب نہایت پست
حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی
قدیم بزرگی اور بڑائی کے نشے میں اب تک بدمست ہیں۔ حاجی لطف علی خان آذر
نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور
جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسب معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ رہیں
تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں اور ہمیشہ سیرگاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی ہے محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں
میں سب سے اوّل ہندوستان پر لشکرکشی کی ہے شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری
کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز و شاداب قطعۂ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان
میں لکھا ہے کہ شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے

شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو۔ پھر صفاریوں اور دیلمیوں[1] کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضد الدولہ دیلمی[2] کے زمانے میں اُس کی آبادی اِس درجے کو پہنچی کہ شہر میں اہلِ لشکر کی گنجایش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام شوق الامیر رکھا گیا اور اُس کے بیٹے صمصام الدولہ نے اِس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی +

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد، بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ازاں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے۔ ؎

بدہ ساقی مےِ باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔۔۔ کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ را

شیخ علی حزیں نے بارھویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی اُس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانحِ عمری میں اُس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ "شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ جس قدر چاہو کتاب کے مطالعہ اور فکر و غورِ مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اُکتائیگا" +

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی۔ باشندوں کے خیالات اور قوے پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علما و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ نے بوستاں، کے دیباچے میں اہلِ شیراز کو اُن تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے

---

[1] صفاریوں میں تین بادشاہ ہوئے چالیس برس اُن کی سلطنت رہی۔
[2] دیلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت ۱۲۰ برس رہی۔

وہ حالاتِ سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علما و مشائخ و شعرا و مصنفین ابتدا سے اخیر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعثِ افتخار نہ تھا +

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدّین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلّص ہے۔ عہ سر گور اوسلی نے اُس کی ولادت ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۵ء لکھی ہے۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سالِ مذکور سے بہت برسوں پیچھے اتابک مظفر الدّین تکلہ بن زنگی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تختِ شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اِس لیے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا

ملہ اُس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا صرف سالِ وفات سب نے لکھا ہے یعنی ۶۹۱ھ ہجری اور اُسکی عمر ۱۰۲ یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے پس کم سے کم عمر لینے سے اُسکی ولادت ۵۸۹ھ میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی جو بغداد میں اُسکا جلیل القدر اُستاد تھا اُسکی وفات کے وقت جو کہ قطعاً ۵۹۷ھ میں ہوئی ہے شیخ کی عمر آٹھ برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقع ہے اسی لیے اُسکی عمر ۱۲۰ برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے +

عہ سر گور اوسلی نے تکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اُسکے وقت میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسکا سبب یہ ہے کہ بوستان جس سنہ میں ختم ہوئی ہے بادشاہ حقیقی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے سو پس شاہانِ پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے +

باپ جیسا کہ اُسکے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک با خدا اور متورع آدمی تھا شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کرتا روزے کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری۔ اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا۔ اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال واقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا۔ اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ بوستاں میں کہتا ہے

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت   نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت

بخردی بخورد از بزرگاں قفا   خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کمسن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہو گا۔ کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگرد رشید۔ اور ہلاکو خاں کا مصاحب خاص تھا۔ شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا۔ مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی۔ جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال شیخ اور علامہ دونوں ہمعصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوے کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اسکے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اسکے قرب و جوار میں علما و مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی۔ اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطۂ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے۔ بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے تحصیلِ علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیلِ علم کا سامان مہیّا تھا۔ علماے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسۂ عضدیّہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قایم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہلِ شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دِل۔ بامروّت اور فیّاض بادشاہ تھا مگر اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا اور اپنی مُہمات کے شوق میں ممالکِ محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُسکی غیبت کے زمانے میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے۔ اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اوّل اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سُلطان

غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج
کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا - ایسی حالت میں
تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی - اِس کے علاوہ
امن کے زمانے میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں خلل انداز
ہوتے ہیں - یہ اسباب تھے - جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا - چنانچہ ذیل
کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے ؎

دلم از صحبت شیراز بہ کلی بگرفت ۔۔۔ وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حب وطن گرچہ حدیثیست صحیح ۔۔۔ نتواں مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ:- میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا - اَب وہ وقت ہے کہ مجھ سے
بغداد کا حال پوچھو - اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے - مگر اِس ضرورت
سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مرا نہیں جاتا -

اس زمانے میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلادِ اسلام میں جابجا کھلے
ہوئے تھے جہاں دور دور سے طالب علم آآکر علم تحصیل کرتے تھے - ہرات -
نیشاپور - اصفہان - بصرہ - اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر
الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے اِن کے سوا شام عراق

سلہ ان میں سے مدرسۂ ناصریہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں اور مدرسۂ رواحیہ رواحہ کے بیوپاری زکی ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا - اور مدرسہ ست الشام خاتون بنت ایوب ہمشیرہ صلاح الدین کا اور مدرسۂ نوریہ ملک عادل نور الدین کا دمشق میں - اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں - اور صلاحیہ سلطان صلاح الدین کا قاہرہ میں - اور نوریہ عز الدین ارسلان شاہ صاحب موصل کا موصل میں مشہور تھے ان کے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا کہ مدرسۂ ثقفیہ نظامیہ عزیزیہ سعودیہ - تتشیہ - لطفیہ - علائیہ وغیرہ وغیرہ بیت المقدس - موصل - بغداد - دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے -

اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ ہجری میں بنوایا تھا۔ ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسے سے تعلیم پاکر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علما یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابو حامد غزالی۔ شیخ عراق عبد القاہر سہروردی۔ اُستاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ شیخ کو اس مدرسے میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اُس کا ہموطن شیخ ابو اسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرۂ آفاق تھا، مدت تک اس مدرسے کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اوّل یہاں کا متولی شیخ ابو اسحاق کو مقرر کیا تھا۔ اور اسی سبب سے اہلِ شیراز کو اس مدرسے سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسۂ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ بوستاں میں اُس نے تصریح کی ہے وہاں سے اُس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا اُن میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن ابن جوزی ہے۔ جس کا لقب جمال الدین ہے یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے

حدیث قلمی ہے اُن کا تراشہ میرے حجرے میں ہے مرنے کے بعد مجھکو نہلائیں تو غسل کے لیے اس تراشے سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اُس کی وصیت کے موافق عمل کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا +

جس زمانے میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا۔ اس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی و سرگور اوسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علمِ تصوّف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کی حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ کی وفات ۵۶۱ھ ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے۔ اور ایک بار سفرِ دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے۔ اُستاد یہ سنکر شیخ پر غصہ ہوا اور کہا کہ اوروں کے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے +

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابو الفرج ابنِ جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا۔ کہ اِس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علما کی ہوسائٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بد آواز قوال سے پالا پڑا اور بضرورت ساری رات اُس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اِس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اِس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مُربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اِس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اِس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی +

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے عالم طالب علمی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اُتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقے کو چھوڑ کر اِس کوچے میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں +

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اُس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھکر تعلق نہیں رہا چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے ؎

بسعادِ عراق جائے خوش نا یوم بودئے ساقی بزن نوائے زانکہ پردۂ عراقی

جس زمانے میں شیخ نظامیۂ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا۔ اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھالا لیا تھا۔ اطرافِ عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور اربابِ حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے شہریار اور فرماں روا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصرِ خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بہ منزلۂ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو اُمراء اور اعیانِ سلطنت قصرِ خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدت پہلے سے رستے کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے تنگ جاتے تھے۔

الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر اُسی آنکھ سے اُس دار الخلافہ کا بے چراغ ہونا جو ستر برس تک بارگاہِ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اُس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یورپ

ایشیا- اور افریقہ پر برابر ٹپتا تھا اور خلیفہ اور اُس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس
اور کئی لاکھ اہلِ لشکر اور اہلِ بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا
اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا
مشاہدہ کیا تھا- شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی
تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم وستم بھی اُس کی آنکھوں
کے رُوبرو گزرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے اِن حوادث
و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عُمدہ سبق تھا- جس نے اُس کے
دل میں قوم کی دلسوزی- بادشاہوں کی اصلاح- رعایا کی ہمدردی- اور ہر طبقہ
کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کردیا تھا- اور اسی خیال کی بدولت اُس نے اپنی
تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی +

مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُس وقت لکھا ہے جب
کوئی شخص اُس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار
وغمگین باقی نہ تھا- اُس مرثیے کے چند ابیات اس موقع پر نقل کرنے مناسب
معلوم ہوتے ہیں +

ابیات

اشعار	ترجمہ
۱- آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوالِ مُلکِ مُستعصم امیرالمومنیں	آسمان کا فرض ہے کہ مُستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے +
۲- اے محمد گر قیامت مے برآری سر زخاک سر برآور وین قیامت درمیانِ خلق بیں	۲- اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو قبر سے باہر نکلینگے تو ابھی نکل کر قیامت دُنیا

میں دیکھ لیجیے +

۳- نازنینانِ حرم را خونِ حلقِ نازنین
زآستاں بگذشت و مارا خونِ دل از آستیں

محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا +

۴- زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار
در خیالِ کس نگشتے کانچناں گردد چنیں

زمانے کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائیگا +

۵- دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام
قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقان بر زمیں

جنھوں نے اُس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھے تھے وہ ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں +

۶- خونِ فرزندانِ عمِ مصطفےٰ شد ریختہ
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

کہ پیغمبرِ خدا کے بنی عم کا خون اُس خاک پر بہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے +

۷- بعد ازیں آسائش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگیں

آیندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیے کیونکہ انگوٹھی پر سے جب نگینہ جاتا رہتا ہے تو نری کلونس رہجاتی ہے +

۸- دجلہ خونناب ست زیں پس گر نہد سر در نشیب
خاکِ نخلستانِ بطحا را کند با خوں عجیں

دجلے کا پانی بکثرت لہو ہو گیا ہے اگر اب جاری رہیگا تو نخلستانِ بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دیگا +

٩- نوحہ لایق نیست بر خاکِ شہیدان زانکہ ہست
کمترین دولت مر ایشان را بہشتِ برترین

شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اُن کے لیے ادنٰی نعمت فردوسِ بریں ہے +

١٠- لیکن از روئے مسلمانی و در راہِ رحمت
مہرباں را دل بسوزد در فراقِ نازنیں

ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے +

١١- باش تا فردا کہ بینی روزِ داد و رستخیز
کز لحد با روئے خوں آلودہ برخیزد چنیں

کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہلِ قبر لہو بھرا مُنہ لیکر اُٹھینگے +

١٢- تکیہ بر دنیا نباید کرد و دل بروے نہاد
کآسماں گاہے بمہرست اے برادر گہ بکیں

یارو- دنیا پر بھروسا کرنا اور اُس سے دل لگانا نہیں چاہیے کیونکہ آسمان کبھی دوست ہے اور کبھی دشمن +

١٣- زورِ بازوئے شجاعت برنیاید با اجل
چوں قضا آید نماند قوتِ رائے رزیں

شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے +

١٤- تیغِ ہندی برنیاید روزِ ہیجا از نیام
شیر مردے را کہ باشد مرگ پنہاں در کمیں

جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے اُس کی بھی تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی ہے +

١٥- تجربت بیفائدہ است آں را کہ برگردید بخت
حملہ آوردن بجہ سود آں را کہ برگردید زیں

جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اُس کا امتحان کرنا بے فائدہ ہے اور جب زین اُلٹ گیا تو پھر حملہ کرنا فضول ہے +

۱۶- کرگسا ستدانیے مُردار دنیا جنگجوے ۔ یارو مُردار دنیا کے لیے بلا آپس میں لڑرہے ہیں
اے برادر گر خرد مندی چو سیمرغان نشیں ۔ ہیں - اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغوں کی طرح الگ بیٹھو +

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا - اگرچہ اِس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی نیکی اور انصاف نہ تھا - تکبّر اور غرور نے اُسکے دماغ کو مختل کر دیا تھا - غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایکبار اُس کے بیٹے ابوبکر نے اہلِ سنّت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر اُس نالائق خلیفہ نے اِس کا کچھ تدارک نہ کیا - لیکن اِس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا - مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابلِ نفرین سمجھو مگر یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ اُس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے - ایک بارگی اُن میں تزلزل آگیا - اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہوگیا - پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیّت تھی - اُس کے لیے اس سے بڑھکر اور کیا مصیبت ہوسکتی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باراں کی طرح بہایا گیا ،،
جس عمارت کی بنیاد خلفاے راشدین کے ہُنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ

چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہوگیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو اُن کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہمارے بعد بہت رُوئے ہم کو اہلِ وفا ــــ کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

القصہ شیخ مدرسۂ نظامیہ سے نکل کر مدتِ دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رہا۔ جب کتاب کے مطالعہ سے جی سیر ہوگیا تو نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیلِ علم کی ہے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ یہ تیس تیس برس چار مساوی حصّے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون منوشاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصّوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصّہ تحصیلِ علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ "شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرۂ کامل رکھتا تھا"۔ اگرچہ اُس کی شہرت طبقۂ علما میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرۂ شعرا میں ہوئی مگر اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سُلجھا ہوا عالم تھا بعض موقعوں پر فقہا اور قضاۃ کے مجمعوں میں اُس کو بحث و مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے۔ اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام

یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے جان پہچان کم تھے کسی تقریب سے قاضئے شہر کی مجلس میں اُس کا گزر ہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علما و فقہا کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدّام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا۔ اور مشکل سے پائینِ مجلس جگہ ملی۔ اُس وقت کسی مسئلے میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دُور ہی سے باواز بلند کہا کہ اگر مجھکو اجازت ہو تو اس باب میں مَیں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجّہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اِس مسئلے کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی۔ قاضی نے مسند چھوڑ دی۔ اور عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے۔ جب لوگ مجھکو حقیر اور ذلیل معلوم ہونگے تو پھٹے پُرانے کپڑے والوں سے مَیں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤنگا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہکر وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگذشت بوستاں میں اِس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر کی سرگذشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص اپنی رُوداد لکھی ہے۔

شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے۔ مگر ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجّہ کی تھی۔ زیادہ تر اُسکی توجہ دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاصکر

وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسۂ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اُس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلادِ شام میں اُس نے مدتوں وعظ کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہلِ مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا۔ اُس نے میرا بیان سن کر ایسا پُرجوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اُس کے ساتھ چیخ گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب۔ شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی۔ بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے سوا بت خانۂ سومنات کے قصّہ میں اُس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا۔ سرگور اوسلی لکھتے ہیں کہ ایشیاٹک جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ ۱۸۴۳ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی تیسی نے لکھا ہے کہ "سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان یعنی ریختہ میں جب کہ وہ سومنات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے"۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اُس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اُس زمانے میں ہوا ہے۔

جب کہ ریختہ کی بُنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اُس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے۔ اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔ **اشعار**

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے — گفتا کہ وُرلے باد سے اِس مُلک کی یہ ریت ہے

ہمنا تمھن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دُکھ دیا — ہم یہ کیا۔ تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ — شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں اِن اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ اِس شخص کو سعدی شیرازی کہنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔

سر گور اوسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ مختلف زبانیں اُن مُلکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے اس بیان میں بھی ظاہرا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ایک مُدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف مُلکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا۔ شام۔ عراق۔ فلسطین۔ مصر۔ یمن اور ہندوستان میں مُدتِ دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ وہ اِن مُلکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو۔ اِس کے سوا اُس نے اور بہت سے مُلکوں کی سیر کی ہے جس میں اکثر کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال

مسٹر گورِ ڈوسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھکر اور کوئی سیّاح ہم نے نہیں سُنا۔ اُس نے ایشیاے کوچک۔ بربر۔ حبش۔ مصر۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ عرب۔ جملہ ممالکِ ایران۔ اکثر ممالک توران۔ ہندوستان۔ رُودبار۔ دَیلم۔ کاشغر اور جیحوں سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستھین[۱] وال تک کی سیر کی تھی"۔ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندوستان میں آنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ ازاں جملہ ایک دفعہ پٹھان اغلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی میں آیا ہے"۔ ہمارے نزدیک یہ مضمون محض بے سروپا ہے۔ اغلمش کوئی بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا۔ شاید سلطان التمش کے دھوکے میں اغلمش لکھا گیا ہے۔ بیشک شیخ نے اغلمش کا ذکر گلستاں میں ایک جگہ کیا ہے۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ "سرہنگ زادۂ را بر در سرائے اغلمش دیدم"۔ مگر ہندوستان میں کوئی اغلمش یا سراے اغلمش نہیں سُنی گئی۔ سعدی اور امیر خسرو کی مُلاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواہرالاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندوستان میں آیا ہے۔ مگر اس کا ثبوت کچھ نہیں ہے۔ بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلافِ قیاس ہے۔ خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ

---

[۱] ستھین وال سے مراد شاید سدِّ سکندری ہے۔ کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سدِ سکندری تک گیا ہوں۔

ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بغرضِ محال پچیس برس کی عمر میں ایران تک
پہنچ گئی تھی۔ تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیونکر
خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانۂ وقت اور مقبولِ خاص و
عام ہو ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سُنکر ایران سے ہندوستان میں آئے۔
البتہ معتبر حوالوں سے اِس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے
بیٹے قاآن محمد سلطان ناظمِ ملتان نے جس کو خانِ شہید کہتے ہیں۔ شیخ سے دو بار درخواست
کی کہ آپ شیراز سے یہاں آ جائیے۔ اور چونکہ امیر خسرو اُس وقت محمد سلطان کے
مصاحبوں میں تھے۔ اِس لیے اُن کا کلام بھی شیخ کے ملاحظے کے لیے بھیجا۔ شیخ
اُس وقت بہت معمر ہو گیا تھا اس سبب سے خود نہ آ سکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے
دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خانِ شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت
یہ لکھا کہ اِس جوہرِ قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے ❊

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف بوستان سے
اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دورہ کیا
ہے اور وہاں سے بحرِ ہند اور بحرِ عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے ❊

شیخ کے سفر جس قدر گلستاں اور بوستاں سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی تفصیل
یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتار تک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ
میں مقیم رہا ہے۔ جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھیرا۔
اور سومنات سے مغربی ہندوستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب کو چلا گیا تھا
اور مغرب کی طرف عراقِ عجم۔ آذربیجان۔ عراقِ عرب۔ شام۔ فلسطین۔ اور

ایشیائے کوچک میں بارہا اُس کا گزر ہوا ہے۔ اصفہان۔ تبریز۔ بصرہ۔ کوفہ۔ واسط
بیت المقدس۔ طرابلس الشرق۔ دمشق۔ دیار بکر۔ اور اقصائے رُوم کے شہروں
اور قریوں میں مدّتِ دراز تک اِس کی آمد و رفت رہی ہے۔ مغرب کی جانب
عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھیرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان سے
مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدّت تک قیام کرنا۔ حجاز میں
پہنچنا۔ اسکندریہ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں ؛

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیجِ فارس۔ بحرِ عمّاں۔ بحرِ ہند
بحرِ عرب۔ بحرِ قلزم اور بحرِ رُوم میں اس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبرز
اِن سائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یُورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے۔ لیکن
شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں
کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیئے ہیں۔ اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی
ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک سفر کا حال بوستاں میں اِس طرح لکھتا ہے کہ بیابانِ
فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ہُوا کہ مَیں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا۔ پیچھے
سے ایک شتر سوار آیا اور اُس کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے
کا ارادہ کیا ہے جو جرس کی آواز سن کر بھی نہیں اُٹھتا بیابانِ فید جس کا
اِس حکایت میں ذکر ہے ایک صحراے لق و دق چھ سَو میل لمبا اور چار سو میل
چوڑا ہے۔ جو حجاج کوفے سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستے کے بیچوں بیچ
فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفے سے تقریباً
۳۲۵ میل ہے۔ اور اِسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اس صحرا

میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی ایسی راہ سے پیادہ پا حج کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اُٹھائی ہیں ٭

کریم خاں زند نے اپنے عہدِ حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے اس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطے کے دروازے پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستاں کا ترجمہ انگریزی چھاپا ہے۔ اس میں شیخ کی اُس تصویر کا فوٹو بھی چھاپا ہے شیخ کی شبیہ میں ایک کشکول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تبر اُس کے کندھے پر ہے جو اُس کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے ٭

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سر و سامان اور متوکّل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔ اور بعض موقعوں پر اُس کو حالتِ سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں ٭

ساتویں صدی ہجری اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے جس کا ذکر گلستاں کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا

؎ بمبئی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفرنامہ میں اس تصویر کا مفصل حال لکھا ہے ٭

اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرقی ٹریپولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لیے خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلگیریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے ساتھ لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگا یا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ دردانگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے! جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دیکر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی ناکتخدا تھی شیخ کا نکاح سَو دینار مہر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مگر بیوی کی بدمزاجی اور زباں درازی سے شیخ کا دم ناک میں آگیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا۔ کہ کیا آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دیکر خریدا ہے! شیخ نے کہا ہاں بیشک میں وہی ہوں! دس دینار دیکر مجھے خریدا اور سَو دینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گذری ہیں وہ گلستاں میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ میرے

پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اِسی حالت میں غمگین اور تنگ دل کوفے کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُس وقت میں نے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے +

عالمِ غربت میں کبھی کبھی عسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گذرنے لگی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک ہیجڑا نہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے۔ شیخ کے پاس آئے اور اُس ہیجڑے کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی۔ شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے تو بھی کُتّے کا جُوٹھا نہیں کھاتا +

شیخ کے وقائعِ سفر میں جو کہ اُس نے گلستاں اور بوستاں میں بیاں کیے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے جو بوستاں کے آٹھویں باب میں مذکور ہے۔ یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ "جب مَیں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بُت کی پرستش کے لیے دُور دُور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مُرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہُوا کہ جاں دار ایک بیجان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اِس بات کی تحقیق کے لیے مَیں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ اِس بے حس

مورت پر کیوں اِس قدر فریفتہ ہیں اور اُس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پوجاریوں کو خبر کردی۔ سب نے مجھکو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اپنے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرارِ نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس مورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا، جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ چلے گئے تو برہمن نے ہنسکر مجھ سے کہا کیوں اب کچھ شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اُس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا۔ تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا۔ اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا جس کے پیچھے ایک پوجاری چھپا بیٹھا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب وہ اُس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اُس مورت کا ہاتھ اُٹھ جاتا ہے۔ اِسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پوجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اُس

خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے۔ اُس کو پکڑ کر ایک کنوے میں گرا دیا۔ اسکے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان میں ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا +

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزار دلا پوجاری اور سیکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سیکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ اِس کے سوا ایسے سناٹے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ پردے کے پیچھے ایک پوجاری کا دُور مقام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا؟ اور کیوں تھا؟ +

اِس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ واقع یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بنکر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنوئیں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو۔ مگر اِس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ اِس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدّعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رَو میں بہکر اصل واقعہ سے دُور پڑ جاتا ہے۔ پس اگر اُس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہلِ غرض کو اُس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے بوستاں کے اسی باب میں ایک بادشاہزادے کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑے

سے گر کر اُس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ پھر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے
علاج سے اچھی ہوگئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اُس کی طرف
کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے
روز ایک دوا بھیجی کہ اُس کی دُھونی سے بالکل آرام ہو جائیگا۔ اُس سے بادشاہ
کو ایک چھینک آئی۔ اور اُس کی گردن جیسی چوٹ لگنے پر ہوگئی تھی ویسی ہی
پھر ہوگئی۔ اسی حکایت کو شیخ نے ایک ۴۳ بیت کی مثنوی میں جو بحر ہزج میں ہے بیان
کیا ہے اور یہ اُس کے کلّیات میں موجود ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں قصّے کے
جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں
صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بوٹی بھیجی تھی۔ اور دوسری جگہ ایک تخم
بھیجا تھا۔ ایک جگہ بادشاہ کا قصّہ لکھا ہے۔ اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا۔ ایک جگہ
لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دُھونی سے چھینک آئی۔ دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں
اِس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ ناظم کو حُسنِ بیان اور زینتِ الفاظ کا پُورا
پُورا خیال ہو قصّے کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے۔ پس
بہ نسبت اِس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اُس کے بیان کو
اِس مقام پر ادائے مطلب میں قاصر سمجھا جائے +

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعدِ زنگی کی ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لیے
ترکِ وطن اختیار کیا تھا۔ سعدِ زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا۔ اور ۶۲۳ھ ہجری

ں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانے میں وطن نہیں آیا۔
ونکہ اُس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت ابتر و خراب دیکھی تھی۔
تابک اُو زبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج
ونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی
بلکہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اُس نے فارس کو جو ڈو سو برس سے موردِ آفات و
وادث تھا۔ چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں
ہت مبالغے کیے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنی خوبیوں کے سبب
ے انتہا شہرت اور نیکنامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اُس کی
شہرت سُن کر آتے اور اُن کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں۔
عبادت خانے۔ مدرسے اور مسجدیں جو ویراں ہو گئی تھیں، اُس کے عہد میں آباد
ہو گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک
شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حاذق طبیب اُس پر مامور کیے۔ اپنی دانشمندی
ور حُسنِ تدبیر سے مُلکِ فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کے سیلابِ بلا سے جس کی کہیں پناہ
نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور ۶۲۳ء سے ۶۵۸ء تک سلطنت کی مدّت تک اس کے
عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رُخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت
کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شہرہ دُور و نزدیک برابر سُننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق
بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و چین قائم ہو گیا تب شام
سے عراقِ عجم ہوتا ہوا اور اصفہاں میں ٹھیرتا ہُوا جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت
سے مفہوم ہوتا ہے شیراز میں پہنچا۔ شیخ کے کلیات میں ایک قطعہ ملتا ہے۔ جس سے

ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدّت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ

۱۔ ندانی کہ من در اقالیمِ غربت
چرا روزگارے بکردم درنگی؟
۱ تجھ کو معلوم نہیں؟ کہ میں نے پردیس میں ایک مدّت تک کیوں توقف کیا +

۲۔ بروں رفتم از تنگِ ترکاں کہ دیدم
جہاں درہم افتادہ چوں مُوئے زنگی
۲ میں تُرکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہو رہا تھا +

۳۔ ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن
چو گرگاں بخونخوارگی تیز چنگی
۳۔ سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے +

۴۔ دروں مردمے چوں ملک نیک محضر
بروں لشکرے چوں ہزبرانِ جنگی
۴۔ شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر لشکر کے لوگ جنگی شیروں کے موافق تھے +

۵۔ چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم
پلنگاں رہا کردہ خوئے پلنگی
۵۔ جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی +

۶۔ چناں بود در عہدِ اوّل کہ دیدم
جہانے پُر از آشوب و تشویش و تنگی
۶۔ اگلے زمانے میں جب کہ ملک کو آشفتہ اور پریشان و تنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا +

۷۔ چنیں شد در ایّامِ سلطانِ عادل
اتابک ابوبکر بن سعدِ زنگی
۷۔ اور اب بادشاہِ عادل ابوبکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہو گیا ہے +

شیراز میں پہنچ کر ظاہرا شیخ نے جامۂ علم و فضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا کیونکہ اتابک ابوبکر میں باوجود اُن تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی تھا۔ وہ ہمیشہ عُلما و فُضلا سے بدگمان رہتا تھا۔ اور

جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا اور اُن کے ساتھ کمال ارادت و
عقیدت ظاہر کرتا۔ اِسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر ائمہ و عُلما کو اُس نے
جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا۔ ازانجملہ امام صدرالدین محمود واعظ اور امام شہاب الدین
توروپشتی اور مولانا عزّالدین ابراہیم قیسی کو کہ اقسامِ علوم میں یگانۂ روزگار تھے۔
بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا۔ قاضی عزّالدین علوی جو کہ سندی
سیّد اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا اُس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ صاحب
سعید عمید الدین اسعد کو جو کہ بہت ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا۔ ماخوذ کیا اور مع
اُس کے بیٹے تاج الدین محمدؒ کے ایک قلعہ میں کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مر گیا۔

اِسی سبب سے اہلِ علم اپنا کمالِ علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جہلا مشائخ
کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ وصّاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی
مشیخت مآب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اُس کی بہت تعظیم و تکریم کی
اور جب نمازِ مغرب کا وقت آیا تو اُسی کو امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قراءت غلط
پڑھی مگر جس قدر اُنھوں نے قراءت میں غلطیاں کیں اُسی قدر اتابک کو اُن کے
ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر اُنھیں رخصت کیا۔

پس شیخ کے لیے علما کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ بہت سی
صفات اُس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اُس کا مرجع خلائق بننا ایک
ضروری امر تھا۔ مثلاً علم و فضل۔ شاعری لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی۔ فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ
اور اہلِ علم کے مرجع خلائق بننے سے ابوبکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اِس کے علاوہ بادشاہ
اور عالموں کے چال چلن پر خردہ گیری کرنی، ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعی کھولنی

اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس غرض کے لیے عُلما اور واعظین کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ ظاہرا وہ اسی سبب سے جیسا کہ گلستاں کے دیباچے میں مذکور ہے۔ ابوبکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے اُس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اُسی کے نام پر گلستاں لکھی گئی ہے۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاصکر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اِس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور اُن کی بدخصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اُس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں مگر اُس نے ایسے لطیف پیرایوں میں اُن پر چوٹیں کی ہیں کہ کسی کو گرفت کا موقع نہیں ملا۔

اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تعریضیں کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اوّل مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دیکر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور اُن کو ظلم و تعدی کے بُرے نتائج سے متنبّہ کیا ہے۔ اور طرح طرح سے رعیّت کے حقوق جتائے ہیں۔ اور اُن کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں۔ اتابک جو عُلما کا مخالف اور مشائخ و زہّاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اُس کی تنبیہ کے واسطے گلستاں اور بوستاں میں اُس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستاں کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتّے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک

عمدہ بستانسرا میں اُتارا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کا آرام اور آسائش پائی، شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا۔ ہیئت اور صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدمبوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اور کہا جس قدر کہ مجھکو علما اور زاہدوں سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں۔ فیلسوف وزیر نے عرض کیا حضور! شرطِ دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کیجائے اور اس لیے علما کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ وہ اطمینان سے درس اور نصیحت میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قایم رہیں۔

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے یعنی " ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کرونگا۔ جب اُس کی مراد پوری ہوگئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی۔ کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے۔ غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن اِدھر اُدھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا حضور! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کیا بکتا ہے میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہونگے۔ کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ تو لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سُن کر ہنس پڑا اور فرمایا۔ جتنی کہ مجھکو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ہے اُسی قدر اس مردود کو اُن سے عداوت ہے مگر کہتا سب سچ ہے"۔

اسی طرح اور بہت سی حکایتیں گلستاں اور بوستاں میں موجود ہیں۔ گلستاں کی ایک حکایت

ہیں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین عہد و مشائخ روزگار کے عیب اور بُرائیاں بیان کی ہیں۔ اِس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار اور مرجّح قرار دیا ہے۔ مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولتمندوں کی مذمت کرتا ہے۔ اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تونگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے +

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بیباکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیرخواہی کا سچّا جوش پیدا ہو گیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ رُوک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علما و صلحاء سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی علاء الدین جوینی جو کہ سُلطان اباقا خاں[1] کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے اُن سے بھی ملاقات کرے۔ ایک روز اُن کے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا کہ اباقا خاں کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کترا کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا۔ اور فوراً گھوڑوں سے اُتر کر شیخ کی طرف آئے۔ اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا، حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اِس راہرو آدمی کے برابر نہیں کی، یہ کون شخص ہے؟ جب

---

[1] ہلاکو خاں کا بیٹا جو اُس کے بعد بادشاہ ہوا +

دونوں بھائی شیخ سے مِل کر واپس آئے۔ تو آباقا خاں نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اِس قدر تعظیم کی۔ صاحب دیوان نے عرض کیا۔ حضور! یہ ہمارا شیخ ہے۔ حضور نے سُنا ہوگا۔ شیخ سعدی اِسی کا نام ہے۔ اور اِس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے۔ آباقا خاں نے کہا۔ اِس سے ہمکو بھی ملواؤ۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے۔ اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا، دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائیگی، مگر نیکی یا بدی اَب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سو لیجاؤ۔ اباقا خاں نے کہا۔ اِس مضمون کو نظم کردو، تو بہتر ہو۔ شیخ نے اُسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا قطعہ

شہے کہ پاسِ رعیّت نگاہ می دارد　　حلال باد خراجش کہ مُزدِ چوپانی ست

وگرنہ راعیِ خلق است۔ زہرمارش باد　　کہ ہر چہ می خورد از جزیۂ مسلمانی ست

آباقا خاں یہ قطعہ سُن کر آبدیدہ ہوگیا۔ اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت

آباقا خاں شیخ کی آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہُوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا

علی بن احمد جامع کلیّاتِ شیخ، اِس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانے کے مشائخ و علما ایسی بے باکانہ نصیحت ایک بقّال کو بھی نہیں کرسکتے اور اسی لیے زمانے کا جو حال ہے وہ سب پر رُوشن ہے

یَں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آباقاخاں ہلاکو خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اگرچہ اباقاخاں کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی۔ لیکن بہرحال وہ اسلام سے بیگانہ تھا۔ اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ایسا کام اُسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدے کی اُمید، جیسا کہ شیخ نے گلستاں میں خود لکھا ہے۔

"نصیحتِ بادشاہاں گفتن کسے را مُسلّم است کہ بیم سر ندارد و امیدِ زر"

سردار انکیانو، جو بعدِ زوالِ خاندانِ اتابکیہ کے ۶۶۳ھ میں سلطان آباقاخاں کے حکم سے صوبۂ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا۔ ایک مغل صاحبِ ہیبت و شان نہایت رُعب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا۔ اور ہمیشہ علماے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پندنامہ جو اُس کے کُلّیات میں موجود ہے سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اِس پندنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہ حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ہی میں ختم کر دیے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالکِ ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی

جیسی فارس اور عراقِ عجم ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر معتکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا۔ اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملے کا اندیشہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیت پر رحم کر تاکہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اُس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ اُمید باندھی ہے ❖

اگرچہ سلطنتِ عہد کے اعیان وارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادتمند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحبِ دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعۂ نظم کا نام **صاحبیہ** رکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اوّل مغولِ تاتار کی فتوحات کے بیان میں **تاریخ جہاں کُشا** لکھی ہے۔ شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اِس مقام پر کچھ مختصر حال اِن دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے ❖

جُوَین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطّہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے علم وفضل اور عقل و دانش کے ذریعے سے خانانِ تاتار کے عہدِ حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خاں نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جُوینی کو عطا کی تھی۔ اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو ملک بغداد اور اُس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خاں کے بعد آباقا خاں باپ کا جانشین ہوا۔ تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل

اُس کے قبضے میں دیدی۔ اب اُس نے مُہماتِ سلطنت کے انصرام۔ سپاہ و رعیت
کی دلجوئی اور تمام مُلکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خُراسان
بغداد۔ شام اور آرمینیہ کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔
اُس کی فیّاضی اور سخاوت کی دھوم دُور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارۂ
جیحوں سے شام اور ایشیاے کوچک تک نافذ و جاری تھا۔ اِس پر وہ عُلما و فضلا
کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ حد سے زیادہ
سُلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا۔ ہر طبقے اور ہر درجے کے
لوگوں کی تعظیم اور مدارات اُن کے مرتبے کے موافق کرتا تھا۔ اور علاوہ کمالاتِ علمی
کے علمِ ادب اور شعر میں بھی اُس کو یدِ طُولےٰ حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں
میں دینِ اسلام شائع ہوا اور اُسی کے فیضِ صُحبت سے آباقا خاں کے بھائی سُلطان[1] احمد
نے اپنے گھرانے میں سب سے اوّل اسلام قبول کیا۔ آخر آغو خاں برادر سلطان احمد
کے ہاتھ سے سنہ ۶۸۳ ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے
تھوڑی سی مُہلت چاہی تھی۔ اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے
بیٹوں کے نام ایک وصیّت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلاے تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ وصاف
میں بجنسہ منقول ہے اور جس سے اس کا کمال استقلال و فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔
اس کے چھوٹے بھائی علاء الدین جُوینی نے بغداد کی حُکومت کے زمانے میں
اُس اُجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکو خاں کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا۔ چند سو ن

---

[1] سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا۔ تاتاریوں میں اس سے پہلے صرف برکہ خاں، جوجی خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا۔ جس کے پاس خوارزم و دشتِ قبچاق اور روس وغیرہ کی حکومت تھی۔

مین اپنے عدل و شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو معمور کر دیا۔ نجف اشرف میں نہر کھدوائی۔ جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا۔ اور فرات کا پانی کوفے کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے وہ اس فیاض اور دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے +

تاریخ جہان کشا، جو اُس نے تاتاریوں کے فتوحات کے بیان میں لکھی ہے۔ وہ اُن تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں +

الغرض یہ دونوں بھائی جو کہ دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالاتِ علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حُسنِ اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے۔ شیخ سعدی کے ساتھ ان کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اِن دونوں سے انتہا درجے کی محبت اور الفت تھی۔ ظاہرا جب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاؤ الدین تھے +

ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانسو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دار السلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کے معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھروسے پر اُس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانسو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

خواجہ تشریفم فرستادی و مال   مالت افزوں باد و خصمت پایمال

هر بدیناریت سالے عمر باد — تا بمانی سه صد و پنجاه[۳۵۰] سال

ترجمہ تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی۔ تمھاری دولت زیادہ اور تمھارے دشمن پایمال ہوں۔ تمھاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو جیو تاکہ تم ساڑھے تین سو برس دنیا میں رہو ✣

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور رقم کی بابت تدارکِ مافات کر کے شیخ سے معافی چاہی۔ اِس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں۔ ایک بار اُس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا، جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اُس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ **قطعہ**

سفینهٔ حکمیات و نظم و نثرِ لطیف — که بارگاهِ ملوک و صدور را شاید
بصدرِ صاحبِ صاحبقران فرستادم — مگر بعینِ عنایت قبول فرماید
سفینه رفت و ندانم رسید یا نرسید — بدان دلیل که آینده دیر می آید

---

[۵۱] بُرندق بخارائی جو ایک زبردست شاعر ہے اُس کو بھی یہی اتفاق پیش آیا ہے۔ بادشاہ نے اُس کو پانسو تومان انعام میں بھیجے تھے مگر اس کو دو سو پہنچے اُس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا **قطعہ**

شاهِ دشمن گداز و دوست نواز — آن جهان گیر کو جهان دار است
بَش یوز آلتون کرم فرمودی — [illegible] سلطان به بنده بسیار است
سه صد از جمله غائب است و کنون — در براتم دو صد پدیدار است
یا مگر من غلط شنودستم — یا که پروانه چی غلطکار است
یا مگر در عبارتِ ترکی — بَش یوز آلتون دوستی دینار است

مگر اِس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی شوخی اور لطافت نہیں ہے۔ بُش یوز آلتون کو بشینز آلتون پڑھنا چاہیے۔ یہ ترکی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے ✣

بسیار سالہا ازیں حال مشورت بردم | مگر ز خاطر من بندِ بستہ بکشاید
چہ گفت۔ گفت ندانی کہ خواجہ دریا ئیست | نہ ہر سفینہ ز دریا درست باز آید

ایک بار خواجہ علاؤالدین نے جلال الدین عُتقی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا تبریز سے حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیجدو۔ مگر اُس وقت جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاؤالدین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

پیامِ صاحبِ دیوان علائے دولت و دیں | کہ دیں بدولتِ ایامِ او ہمے نازد
رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را | بسے نماند کہ سر بر فلک برافرازد
مثال داد کہ صدرِ خجستہ جلال الدیں | قبولِ حضرتِ او را تعہدے سازد
ولیک بر سرِ او خیلِ مرگ تاختہ بود | چناں کہ بر ہمہ ابنائے دہر مے تازد
جلال زندہ نخواہد شدن دریں دنیا | کہ بندگانِ خداوندگار بنوازد
طمع بریدم از و در سرائے عقبے نیز | کہ از مظالمِ مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ۔ صاحب دیوان علاؤالدین جس کے عہدِ دولت پر دین کو ناز ہے اُسکی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزّت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسمان تک پہنچ جائے۔ اُس میں حکم تھا کہ امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر لشکرِ اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی جیسے کہ سب پر ہوا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دنیا میں آنے والا نہیں ہے کہ خدا کے بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے اُمید قطع کی۔ کیونکہ وہاں لوگوں کے استغاثے اُس کو میری طرف کا ہیکو متوجّہ ہونے دینگے +

خواجہ علاؤ الدین نے فوراً اُس کی تلافی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اَب اُس کی قبر ہے یہ بھی صاحبِ دیوان کے روپیہ سے بنی تھی۔ اِس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اُس نے شیخ کو دیے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحبِ دیوان نے بہزار منت و سماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اُس رقم سے ایک عالی شان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشۂ شمال و مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشیں رہا۔

شیخ سے اکثر اہلِ علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ ازاں جملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشّاق و ماہر تھا، نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اِس قطعہ سے اُس زمانے کے عُلما کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ

سالکِ راہِ خدا بادشہِ مُلکِ سخن ۔۔۔ اے ز الفاظِ تو آفاق پر از دُرِّ یتیم

اخترِ سعدی و عالم ز فروغِ تو منیر ۔۔۔ واضعِ عقلی و گیتی ز نظیرِ تو عقیم

پیشِ اشعارِ تو شعرِ دگراں را چہ محل ۔۔۔ سحر نے وقع نماید برِ اعجازِ کلیم

بندہ را از تو سوالے است کہ توجیہِ سوال ۔۔۔ نکند مردم پاکیزہ سیر جز بہ کریم

مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق ۔۔۔ ایں درِ بستہ تو بکشائے کہ بابیست عظیم

گرچہ ایں ہر دو بیک شخص نمایند فرود ۔۔۔ در دماغ و دلِ بیدارِ تو ہستند مقیم

پایۂ منصبِ ہر یک ز کرم بازنمائے ۔۔۔ تا ز الفاظِ خوشت تازہ شود جانِ سقیم

بادآسودہ و فارغ زبد و نیک جہاں — خاطرِ آئینہ کردار تو چوں نفسِ حکیم

شیخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اُس کے کلیات میں موجود ہے +

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم و تکریم اور اطاعت کرتا تھا۔ سردار انکیانو، کو وہ برابر قصاید اور پندنامہ وغیرہ میں اِس طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اُس کے سوا ملک عادل شمس الدین جو کہ غالباً انکیانو، کے بعد شیراز کا حاکم ہُوا تھا وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں سنہری فروشوں کے ہاتھ جبراً کسی دعدے پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بُوجھ شیخ کے بھائی کی دوکان پر بھی جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دوکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اُس زمانے میں حضرت ابو عبداللہ ابن خفیف[۵] کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اِس واقعے کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک شمس الدین کو جو کہ اس حال سے بے خبر تھا۔ ایک قطعہ لکھ بھیجا۔ جس میں اہلِ فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دوکانداری اور بے نوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور دہ ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے

---

[۵] یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابرِ صوفیہ میں سے ہیں جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف سے برابر نہیں ہیں +

خرچ کے لیے ہے۔ اس کو قبول کیجیے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی ٭

شیخ کی وفات[1] شیراز میں جب کہ آتابکانِ فارس کے خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس خانانِ تاتاری کی حکومت میں آگئی تھی سنہ ۶۹۱ہجری میں واقع ہوئی۔ کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے۔ تاریخ

دُرِ بحرِ معارف شیخ سعدی	کہ در دریائے معنی بود غوّاص
مہِ شوال روزِ جمعہ ہر دو حش	بداں درگاہ رفت از رُوئے اخلاص
یکے پرسید سالِ فوت گفتم	زخاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص ۶۹۱ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سَو دو برس کی، اور کسی نے ایک سَو دس برس اور اکثر نے ایک سَو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے زمانے میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابنِ جوزی سے علم تحصیل کیا ہے۔ امام ابنِ جوزی کی وفات اِس سے ۹۴ برس بعد واقع ہوئی۔ پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ ۹ نو برس کی عمر میں امام ابنِ جوزی سے تحصیلِ علم کر چکا تھا اور ایک سَو بیس برس کی قرار دیجائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ ۱۶ سولہ برس کی عمر میں تحصیلِ علم سے فارغ

[1] مسٹر گور اوسلی نے اُسکی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر سلغر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اتابک محمد شاہ ۶۶۰ھ ہجری میں تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کرکے مر گیا۔ پھر اُسکا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور ۶۶۱ھ ہجری میں قتل کیا گیا۔ پھر سعد زنگی کی بیٹی آبش خاتون کے نام سکّہ اور خطبہ جاری ہوا۔ اور ۶۶۷ھ میں اُسکو معزول کرکے سردار اباقا خاں نے سردار انکیانو کو جو شیخ کا ممدوح ہے حاکم فارس مقرر کیا۔ اسکے بعد کوئی متنفّس اتابکانِ فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خاندان اتابک کے زوال سے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے ٭

ہو چکا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانے میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلافِ قیاس ہے اسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے +

مسز گورا وسلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرنیکلن کے سفرنامہ سے جو کہ سنہ ۱۷۸۶ء میں فارس گیا تھا۔ شیخ کے مدفن کا حال اس طرح لکھا ہے۔ کہ "شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل جانبِ شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اس کی بہت بڑی اور مربّع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اسکی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کی چوبی قبرپوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اس پر شیخ ہی کا ایک شعر خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اس قبرپوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعے کے لیے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا۔ مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرے کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں۔ یہ اشعار انھوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرے کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اور اگر اب اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائیگی۔ نہایت افسوس کی بات ہے اور زمانے کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اس کی مرمت کرانے کا خیال نہیں۔ اس مقبرے کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے" +

اس کے بعد مسٹر گور اوسلی صاحب لکھتے ہیں کہ "۱۸۱۱ء کے شروع میں جب کہ میں جارج سوم بادشاہِ انگلستان کی طرف سے بعنوانِ سفارت فتح علی شاہ قاجار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا اُس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسٹر فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جاکر ہوتی ہے۔ اُس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہوگئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانۂ سابق میں وہاں تھے اُن کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جاوے تو اس مقبرے کی مرمت بخوبی ہوسکتی ہے اور میرے حسنِ عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا۔ مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کرکے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرادوں مگر شاہِ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا۔ اُس نے اس ارادے سے مجھ کو باز رکھا۔ اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ "میں اپنے روپے سے مزار کی مرمت کرادونگا۔ آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں" اُس نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اُسی اسلوب اور عمدگی سے کرادونگا جیسے کہ کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا +

نہایت تاسف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہیگا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر جو زہد و تقوے اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے؟ +

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس کنارے کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے باوجودِ اختلافِ مذہب اختلافِ قوم اور اختلافِ مُلک کے ایک مسلمان مصنّف کی ایسی قدر کرے کہ عالمِ سفر میں اُسکے مقبرے کی مرمّت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادے سے باوجود اتحادِ زبان اتحادِ مذہب۔ اتحادِ قوم و مُلک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے ؛

فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ ؕ

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شُہرت اس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران ترکستان۔ تاتار اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستاں کے دیباچے میں کہتا ہے "ذکرِ جمیلِ سعدی کہ در افواہِ عوام افتادہ و صیتِ سخنش در بسیطِ زمیں رفتہ" شیراز اور کاشغر میں کچھ کم ۱۶ سو میل کا فاصلہ ہے۔ پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے ✤

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خاں چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لیے اُسکی صلح ہو گئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب العلم مقدمۂ زمخشری[۵۱] ہاتھ میں لیے زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ضرب زیدٌ عمرواً۔ شیخ اُس سے چہل کی باتیں کرنے لگا۔ اور کہا کیوں صاحب! خوارزم و ختا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا۔ خاکِ پاکِ شیراز

---

[۵۱] علامہ جار اللہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس کا نام مقدمۂ زمخشری ہے ✤

اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟ شیخ نے بطریقِ مزاح اُسی وقت دو عربی شعر
کہکر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے
اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھیے۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے
ایک یہ ہے۔ **شعر**

اے دلِ عشّاق بدامِ تو صید　　ما بہ تو مشغول و تو با عمرو زید

صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اُس طالب علم سے کہدیا
کہ سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا
کہ پہلے سے آپ نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گذاری سے سعادت حاصل کرتا۔
اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گذاری سے مستفید ہوں
اُس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے۔ **اشعار**

بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　قناعت کردہ از دُنیا بہ غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی　　کہ بارے بند از دل برکشائی
بگفت آنجا پری رویانِ نغزند　　چو گِل بسیار شد پیلاں بلغزند

اِسی طرح مُلتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو[۵۴] میل ہے دوبار خان شہید سلطان محمد قاآل
نے شیخ کی شہرت سُن کر اُس کو وطن سے بُلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا +
تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام[۵۵] تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ نہایت
مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا
رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے تو نہایت شرمندگی سے عذر معذرت

---

[۵۵] خواجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے امرا میں سے تھا اور شاعری میں معاصرین اُس کو
مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور ۷۱۴ھ ہجری میں وفات پائی +

کرکے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعظیم اور ادب سے اُسکی مہماں داری کی +

مسٹر گور اوسلی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسمٰعیلی مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے۔ شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام وہاں عموماً زبان زدِ خلائق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ محظوظ ہُوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھُل گئی +

شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا۔ اور بہت خوشی سے خوب دل کھُول کر اُس کی مہمانداری کی۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُسکو دکھائینگے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک پہنچ گیا۔ اُس کو کمال افسوس ہُوا۔ اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمانداری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ چند مدت کے بعد حسنِ اتفاق سے شیخ کا گزر قہستاں میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم بہت اخلاق اور محبت سے پیش آیا۔ مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سادہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بھُنے ہوئے تیتر کے سوا کچھ نہ تھا۔ تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلا ہوا پارچہ اور خشکا تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری

ضیافت میں تکلفات کیے تھے اُس طرح سے مہمان آخرکو بار خاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا
طریقہ ایسا نہیں ہے۔ شیخ کو اُس جُملے کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت
کہا تھا اَب معلوم ہوا +

اِس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ وہ مذہبی تعصبات سے مبّرا تھا۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ کے لوگ اُس زمانے میں عموماً ملحد اور
بے دین سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی فرقہ مسلمانوں کے نزدیک اسمٰعیلیوں سے زیادہ مبغوض
اور مردود نہ تھا۔ پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی اُس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور
واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمٰعیلی کی اپنے وطن میں اِس قدر خاطر و مدارات
کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا اور اُس کا مہمان رہا +

الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانے میں تھا اور اُس کے مرنے
کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے حاصل کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں +

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے
کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے
جس میں فردوسی کو مثنوی کا۔ انوری کو قصیدے کا۔ اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے اور
وہ قطعہ یہ ہے قطعہ

در شعر سہ کس پیمبرانند ۔۔۔ ہر چند کہ لا نبیؐ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را ۔۔۔ فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے نفحات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر پر اِس پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی خضر کی ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آبِ دہن اُس کے مُنھ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی +

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی رح اور ہمام تبریزی کو اپنی مثنوی نُہ سپہر میں غزل کا اُستاد مانا ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن میں کنایۃً اپنے کو ترجیح دی ہے۔ مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ شعر

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت ۔۔۔ شیرہ از میخانۂ مستے کہ در شیراز بود

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے اہلِ مذاق سعدیِ ہندوستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ شعر

حسن گلے ز گلستانِ سعدی آوردہ است ۔۔۔ کہ اہلِ معنی گلچیں ازیں گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہمگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہولاکو خاں کے رُکنِ سلطنت بھی تھے یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان۔ امیر معین الدین پروانہ حاکم رُوم۔ مَلِک افتخار الدین کرمانی اور مُلّا نور الدین صدری نے باتفاقِ ہمدگر ایک قطعہ مرتب کر کے مجد ہمگر کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں امامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی اُسکے جواب میں مجد ہمگر نے یہ رُباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی

مااگرچہ بہ نطق طوطئے خوش نفسیم | بر شکرِ گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماعِ اُمم | ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

اِس رباعی میں اگرچہ ہمگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر آمامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے +

حاجی لُطف علی خاں آزر نے مذکورۂ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "بعض مدعیانِ شعر نے مجد الدین ہمگر سے کہ بعنایتِ الٰہی پستیِ طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے سعدی اور آمامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا۔ اُنھوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ مَیں نے اِس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہلِ مذاق جانتے ہیں کہ ہمگر کی تحقیق کیسی بھونڈی ہے۔ ہاں اُنھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ مَیں آمامی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ بیشک آمامی کا مرتبہ جناب صاحبِ رباعی سے بہت بالاتر ہے لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے۔ بلکہ تین شخصوں[۲] کے سوا کسی اور کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے مَیں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانشمندوں پر سخت گزرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخنوروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں۔ جب یہ حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آگیا"۔ حاجی موصوف نے اِس مقام پر مجد ہمگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔ قطعہ

---

[۱] شیخ نے بھی اِس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے جو اُس کے کلیات میں موجود ہے یعنی رباعی

ہر کس کہ بہ بارگاہِ سامی نرسد | از بخت سیاہ و بدکلامی نرسد
ہمگر کہ بہ عمرِ خود نکردہ است نماز | شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

[۲] شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی۔ انوری اور نظامی ہیں +

یکے گفت۔ امامی امام ہری را زسعدی فزوں یافتہ مجد ہمگر
دریں ماجرا چیست رائے تو گفتم ستمگر بود مجدِ ہمگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہمگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور آمامی گزرے ہیں نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور آمامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ معاصرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرتا گیا اُسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہوگئی اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانے میں دو اہلِ کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں اور اسی طرح سے بڑھتے بڑھتے دو بڑے بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے شیخ اور آمامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطرافِ عالم میں پھیل جائیگا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہجائیگا +

کلامِ شیخ کی مقبولیت میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جنابِ الٰہی میں مقبول ہوئی ہے یہ اُس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے۔ بیت

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عُزلت خانے پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔ شاید اِس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو۔ لیکن ہم کو اِس میں کوئی نئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔ خواب کا سچّا ہونا اور اُن میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مُسلّم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اُس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اِس کے علاوہ ہم اِس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اِس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اُس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے +

اِس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لیے شیخ ابوالفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے۔ یعنی یہ کہ فیضی نے نلدمن کی تو ید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا۔ شعر

در ہر بُنِ مُو کہ می نہی گوش فوارۂ فیضِ اوست در جوش

تو اُس نے بھی ویسے ہی صلے کے توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسماں کی طرف مُنھ کیا۔ اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے بیخال کی جو فیضی کے مُنھ پر آ کر پڑی۔ وہ بہت جھنجھلایا اور کہا "شعر فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد" ظاہرا یہ مضمون شیخ عبدالقادر بداونی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے یا اُس کے کسی متتبع کا گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے +

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ھورِیس کے کلام سے بہت ملتی ہے۔ چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی

تھی۔ اِس لیے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مُستفید ہوا ہوگا۔" ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے؟ اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہراً یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضۂ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی زمانے میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اُس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر و ذلیل و ہیچ در ہیچ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے۔ اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اُسکو مجبوراً کسی اور طرف منسوب کرنا پڑتا ہے +

سر ولیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سر گور اوسلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "سعدی نے تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ اتابکانِ فارس وہاں کے اہلِ کمال کو تقویت دے رہے تھے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے تھے۔ حالانکہ اُسکی تقریباً تمام زندگی سفر میں گذری تھی باوجود اُس کے کسی ایسے شخص نے بھی جس کو تمام عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو، اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا +

انگلستان کے بعض اور مُصنّفوں نے اُس کو مشرقی شکسپئر کہا ہے۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو شکسپئر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن جب یہ بات مُسلّم ہے کہ انگریز شکسپئر کو تمام دُنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرقی شکسپئر کہتے ہیں انھوں نے اُس کو کس درجے کا

شاعر تسلیم کیا ہے +

شکسپیئر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نیچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ صاف اور دلنشین ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پند پر رکھی ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اور شکسپیئر کے پلے (یعنی ناٹک) سُن کر کسی شخص کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہمجنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے۔ مگر اُس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے۔ بلکہ یہ گیتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیز دونوں کا کلام مقبول اور دلنشیں ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح شکسپیئر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اُسی طرح شیخ کی گلستاں اور بوستاں کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اُردو میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حُسن اور یہ بات کہ اُنھوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ثابت ہوتی ہے اگرچہ اِسکا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا میں جس قدر گلستاں اور بوستاں کی تعلیم و تعلّم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں۔ اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شکسپیئر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری

ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہٖ مقبول اور دلنشین ہونے کے قابل نہ ہو، کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے +

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم۔ نثر۔ فارسی۔ اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی ابن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیسؔ برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے حسبِ تفصیلِ ذیل ہے۔

۱۔ نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوّف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و حکّام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) +

۲۔ گلستاں + ۳۔ بوستاں +

۴۔ پند نامہ (جس کو عرف عام میں کریما کہتے ہیں) + ۵۔ قصائدِ فارسی (جن میں مرثیے۔ ملمعات۔ مثلثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں) +

۶۔ قصائدِ عربیہ +

۷۔ غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیّبات + ۸۔ دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع +

۹۔ تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم + ۱۰۔ غزلیاتِ قدیم جو غالباً عنفوانِ شباب کی لکھی ہوئی ہیں +

۱۱۔ مجموعۂ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات، مثنویات، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے + ۱۲۔ مطائبات۔ و ہزلیات +

ان تمام کتابوں اور رسالوں میں سے مثنوی پند نامہ یعنی کریما کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اوّل تو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہیں دیکھی گئی۔ دوسرے

شیخ کے کلام میں جو پختگی اور جزالت یا دلفریبی اور جادو پایا جاتا ہے اُس سے یہ مثنوی معرا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ بوستاں اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے۔ شعر

گہے بر طارمِ اعلےٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہذیان اور یہی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔ کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جانا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اُس نے اُس کو کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیات میں اسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہرحال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اسی طرح اُس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے ٭

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کریگی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کرینگے ٭

ناظرین باتمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اُس کو متعصبانہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں۔ بلکہ اُس کو ایک مقتضائے بشریت

سمجھ کر اُسی قدر مواخذے کے قابل ٹھیرائیں۔ جس قدر کہ ایک غلط گو سچی رائے پر مواخذہ ہو سکتا ہے ⁂

گلستاں اور بوستاں

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور اُن کے عیب اور خوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں۔ لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اُس کے رد و کد لکھنا اور اُس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے جس طرح بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی طرح ایسی مقبول اور مسلّم کتابوں کے محاسن بیان کرنے مشکل ہیں۔ اور ویسی ہی طرح اُن پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمے لیتے ہیں۔ اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں ⁂

اِن دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لُب لُباب سمجھنا چاہیے۔ غالباً فارسی زبان میں کوئی کتاب اِن سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں۔ ایران۔ ترکستان تاتار۔ افغانستان۔ اور ہندوستان میں اِن دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے بچپن میں اِن کتابوں کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا۔ اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں سے پڑھا۔ اِن کے بیشمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا اڈیشن ٹیپ اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں اِن کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علما نے اِن کی عزت کی۔ بادشاہوں نے اِن کو سلطنت کا دستور العمل بتایا

منشیوں اور شاعروں نے اِن کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا اور اُن کے
تتبّع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ اِس کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح
یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے*

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حُسنِ قبول۔ فصاحت۔ بلاغت۔ تہذیب۔ اخلاق پند و
نصیحت اور اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک
دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ اِن پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ اَحَدُھُمَا
اَفضَلُ مِنَ الْاٰخَرِ۔ لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دیجائے
تو کچھ بیجا نہیں ہے*

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے
کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ مگر مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اُس سے بھی بڑھ کر
قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اُس کے
بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو*

مسٹر گوراؤسلی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور
فاضل جینٹیَس نے لاطینی میں کیا تھا۔ اُس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب
کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے*

تذکرہ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہُوا ہے اُس میں یا کسی اور تذکرے
میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور
کوئی کتاب مقبول نہیں ہوئی۔ شاہنامہ۔ مثنوی معنوی۔ گلستاں اور دیوانِ حافظ*
ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں مگر

سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی لیکن صرف اِس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلفریب چیز نہ ہو۔ کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہماری رائے میں گلستاں کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اِس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں۔ سب سے اوّل شاہنامہ پر غور کرو۔ قطع نظر اِس سے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے معاملات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں کہ شاہنامہ لکھا گیا۔ اُس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکرکشی و کشورکشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور شجاعت و بہادری کے مضمون اُن کو دل پسند آتے تھے۔ پس ایک ایسی نظم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جانا اُنکی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صدہا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں۔ اور آخر کو اُس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور قہوہ خانوں میں جا بجا گرمئ صحبت کے لیے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصّے جیسے سیمرغ کا زال کو پرورش کرنا۔ طہمورث دیوبند کا دیو و

کو قید کرنا۔ جامِ جمشید کے کرشمے ۔ رُستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اُس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا ۔ اُس کا سیکڑوں دیووں کو مارنا۔ اور مغلوب کرنا۔ اُس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا۔ دِژ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اِسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصۂ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے اِس میں درج تھے۔ جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں۔ اِن باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا ؛

مولانا رُوم کی مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوّف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدّین ابن العربی شیخ صدر الدین قونوی شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ علاء الدولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوّف کی رُوح پھُونک رہی تھیں۔ شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامیں تغزل کی نسبت زیادہ جی لُبھانے لگے تھے۔ شیخ اکبر اور ابنِ فارض کے دیوانوں کے سامنے مُتنبّی اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں۔ حدیقہ اور منطق الطّیر نے رُودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوّف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا۔ جیسے غزنویہ اور سلاجقہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویّہ کے عہد میں حملۂ حیدری کا۔ اِس کے سوا مثنوی میں بھی صدہا عجیب و غریب قصّے اور فوق العادت نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور اُن میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوّف کے علاوہ قصّے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم

کے حق میں ؂ع نیست پیغمبر ولے دارد کتاب + اور مثنوی کے
حق میں ؂ع ہست قرآں در زبان پہلوی + کہا گیا ہے +

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین
کے سوا جو کہ دنیا میں ہمیشہ مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف
کھینچتے ہیں۔ اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اس خیال نے کہ اس میں عشق کی
واردات اور کیفیاتِ عشقِ مجازی کے پیرائے میں ادا کی گئی ہیں اُس کو اور بھی زیادہ
دلچسپ اور دلربا کر دیا تھا۔ پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ
تعجّب کی بات نہ تھی +

گلستاں میں ان وجوہ سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اُس میں رزم تھی نہ عجیب و غریب
افسانے تھے۔ نہ فوق العادت قصّے۔ نہ حقائق و معارف نہ شریعت کے اسرار۔
نہ طریقت کے نکات۔ نہ غزل عاشقانہ۔ نہ قول عارفانہ۔ بلکہ اُس کی بنیاد محض اخلاقی
پند و موعظت پر رکھی گئی تھی جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاصکر
فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصّہ یا ناٹک کے پیرائے میں نہ ادا
کی جائے۔ اکثر مخاطب کی وحشت اور تنفّر کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی طبیعت
میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفّر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا
ہے۔ پس گلستاں کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ اس کی فصاحت و بلاغت
اور حسنِ بیان اور لطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب کیا جائے
اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا +

گلستاں کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر

عینؔ نو بانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانے میں گلستاں کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اُس زمانے کے فضلا اور اُدَبا اُس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زیورِ طبع اور قدرتِ نظمِ عربی دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیبِ نامدار فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانے میں تھا اپنی مشہور تاریخ وصّاف میں گلستاں کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعۂ سعدی

گلے خوشبوے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوے دلآویزِ تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمۂ عربیّہ

اذا ھو فی الحمام طین مُطیّب — توصّل من ایدی کریم الی یدی
فقلت له ھل انت مسک و عنبر — فانّی من ریّاک سکران مُعتدِ
اجاب بانّی کنت طیناً مُذلّلاً — فجالستُ للورد الجنیّ بمعھد
فاثّر فی خلقی کمال مجالسی — والّا انا التراب الذی کنت فی ید

قطعۂ سعدی

گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند | تا دلِ خویش نیازارد و درہم نشود
سنگِ بدگوہر اگر کاسۂ زریں شکست | قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نشود

ترجمہ عربیّہ

ان نال قدًّا من الانذال منقصةً | حاشی لہ ان یذیب النفس بالضجرِ
فالتبر من حجرٍ اذ صار منکسرًا | فالتبر تبر وما یزداد فی الحجرِ

پھر ایک مُدت کے بعد تمام گلستاں کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا۔ جو کئی صدیوں تک عرب۔ شام۔ روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے اُس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے۔ اس کے سوا استنبول کی تُرکی میں بھی اُس کے متعدد ترجمے سنے گئے ہیں جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خاں کے بھائی اور ولیعہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے +

یُورپ میں گلستان اور بوستاں کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں اُن کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش سائیکلوپیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور اڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ۱۸۵۲ء تک چھپے اور شائع ہوئے۔ اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے +

گلستاں کے ترجمے بوستاں کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جینٹیس نے اصل گلستاں معہ لاطینی ترجمے اور کسی قدر حواشی کے آمسٹرڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈورائر نسجو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسل تھا فرنچ میں اُس کا ترجمہ کیا جو ۱۶۳۴ء میں بمقام پیرس چھپا۔ اس کے بعد اصل کتاب سے گاڈین نے ۱۷۸۹ء میں اور سیمالیٹ نے ۱۸۳۴ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرنچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں آولی ایرنس کا

ترجمہ زیادہ مشہور ہے۔ وہ اُس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمے میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمے سے پہلے ڈُورائر کے فرنچ ترجمے سے ایک اور ترجمہ جرمنی میں ہو چکا تھا۔ آوِلی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی قیمت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اوّل ۱۶۵۴ء میں بمقام سیلنر وگ چھپا تھا۔ اور اُسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہوکر آمسٹرڈم میں چھپا۔ اُولی ایریس نے بوستاں کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستاں کا ایک اور ترجمہ کے۔ ایچ۔ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو ۱۸۴۶ء میں بمقام لیپزگ چھپا ہے۔ اِسی مترجم نے بوستاں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام لسٹ گارٹن ہے۔ اور جو ۱۸۵۰ء میں دُو جلدوں میں چھپا ہے۔ انگریزی میں گلستاں کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن ۱۸۰۸ء میں چھپا۔ دوسرا ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ اور ایک ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں جو ۱۸۵۲ء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عُمدہ ہے۔

سعدی کے کلّیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے ۱۷۹۱ء میں چھپوائے تھے۔ اور گلیڈون نے صرف گلستاں ۱۸۰۶ء میں چھپوائی جو دوبارہ ۱۸۰۹ء میں بمقام لنڈن مطبُوع ہوئی۔ پھر ۱۸۰۷ء میں جیمس ڈیمولن نے گلستاں مع اپنے ترجمے کے کلکتے میں چھپوائی۔ جو اُس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چُکی ہے۔ پروفیسر فاکس نے فارسی خواں طلبا کے لیے بوستاں کا نہایت عُمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے۔ جس میں تقریباً نصف کتاب داخل ہے۔ اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیاٹک جرنل میں مع متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگر نے ۱۸۵۱ء میں

بمقامِ کلکتہ گلستاں مع اعراب اور علاماتِ وقف کے چھپوائی تھی - اور آیسٹوک نے
بمقام ہرٹ فورڈ ۱۸۵۰ء میں اُسکو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کرکے مع فرہنگ کے شائع کیا +
مذکورۂ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش سائیکلوپیڈیا میں کیا
گیا ہے اور بہت سے نئے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً ۱۸۵۲ء کے بعد شایع ہوئے ہیں -
ازاں جملہ ۱۸۷۱ء میں جان پلیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے اصل گلستاں
مع انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی - اور
کپتان ولبرفورس کلارک نے بوستاں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۹ء میں کیا - وہ لکھتے ہیں کہ
"یہ ترجمہ اُس نسخے سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں ۱۸۵۸ء میں چھپا تھا"
پھر حال ہی میں بوستاں کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکنن نے نظم میں کیا ہے جس کا
نام **فلوورز فروم دی بوستاں** رکھا ہے +

ہندوستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستاں کا ترجمہ ہوا ہے - ازانجملہ میر شیر علی
افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اردو ترجمہ نظم کا
نظم اور نثر کا نثر میں لکھا ہے - مگر چونکہ اُس وقت تک اُردو زبان خوب منجھکر صاف
نہ ہوئی تھی - اِس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اُس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور
بامحاورہ اور فصیح ہیں - بنگالی - اور گجراتی میں بھی گلستاں کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُن کا
مفصّل حال معلوم نہیں ہے - تماشا میں اوّل شمال مغربی اضلاع میں گلستاں کے
آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا - جس کی اشاعت کو تقریباً تین برس گزرے ہونگے
اِس ترجمے کا نام مترجم نے **پشپوپ باٹکا** (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے -
اسکے بعد ہمارے دوست پنڈت مہرچند داس مہاجن اگروال جینی مذہب متوطن قصبہ

شونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستاں کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے جو ۱۹۳۰ء میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اِس ترجمے کا نام پُشپ وپ بَن رکھا ہے جو کہ لفظِ گلستاں کا مُرادف ہے پنڈت صاحب نے پندنامۂ شیخ یعنی کریما کا بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جس کا نام سیکشا پتری ہے۔

ترجموں کے علاوہ گلستان بلکہ بوستاں کی بھی بہت سی شرحیں اور فرہنگیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے خانِ آرزو کی خیابانِ گلستاں اور ٹیک چند کی بہار بوستاں زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستاں کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور ہر درجے کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے۔ جس طرح اہلِ علم نے مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہلِ تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اُس پر رکھی ہے یا مُنشیوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے۔ اِسی طرح اُمرا نے اُس کے نسخے نہایت خوشخط لکھوا لکھوا کر اُن کو مُطلّے اور مُذہب کرایا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے مُلک کے رئیسوں نے بھی جو درسِ کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے، اُس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخے کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپے کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ اِن باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن گلستاں کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ ہندوستان کے رئیس اِس کو اِس قدر عزیز رکھیں۔ گویّا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک ناڑیوں کی مجلس میں جا پہنچے اور اُن کو محظوظ کر کے اُٹھے۔

گلستاں کے ابواب کی عمدہ ترتیب۔ اُس کے فقروں کی برجستگی، اُس کے الفاظ کی

شُستگی، اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تشبیہات و تمثیلات کی طرفگی، اور بہ باوجود اِن تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک معتدبہ حصّہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا۔ اور اُس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچۂ گلستاں کے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ "بہ بخے از عمرِ گرانمایہ بر و خرج کردیم" مگر دیباچے ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصلِ بہار کے آغاز میں اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہوگئی۔ اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستاں چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذّت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنّف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گھُلاوٹ پائی جائے اُسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اُس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔

یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصّے میں جو فریرا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنّف اریوسٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنّف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے۔ مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ لارڈ میکالے جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنّف ہے اُس کا ایک مسودہ لندن میوزیم میں رکھا ہے اُس میں جا بجا کاٹ پھانس اور حک و اصلاح

پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ ظاہرا شیخ نے جو گلستاں کے دیباچے میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ گلستاں کے لیے جو سرمایہ اُس نے سالہا سال سے جمع کیا تھا وہ پہلے سے اُس کے پاس نا مرتب موجود تھا۔ جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اُس کو مرتب کر دیا۔ یہ ترتیب فصلِ بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اُس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔

گلستاں اور نیز بوستاں کی ترتیب جس سلیقے سے شیخ نے کی ہے۔ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو اِس کام میں بہت دقت اُٹھانی پڑی ہوگی۔ اُس نے اِن کتابوں میں زیادہ تر واقعات لکھے ہیں۔ جو خود اُس پر گذرے ہیں یا اُس کے سامنے پیش آئے ہیں۔ اور ہر ایک بات کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سُنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اِس تمام مجموعے کو گلستاں میں آٹھ باب پر اور بوستاں میں دس باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اُس کے مناسب حکایتیں درج کی ہیں اور ظاہرا علمِ اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو بقدرِ ضرورت ان میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اُس میں علمِ اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدرِ ضرورت آجائے۔ اِس ترتیب کی قدر اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نامرتب کر کے گڈمڈ کر دیا جائے۔ اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجے شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ اُن میں درج نہ کیے جائیں اور تمام مجموعۂ حکایات کو جدا جدا بابوں پر تقسیم کرایا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے +

جس طرح ہر ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے اسی طرح ایران میں بھی اوّل شاعری کا ظہور ہوا تھا۔ اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اوّل ہی اوّل خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدّت کے بعد شروع ہو گیا۔ لیکن شیخ کے زمانے تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہلِ علم کسی قدر خواص کے روزمرّہ میں تحریر کرتے تھے۔ چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفرنامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا۔ اس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں اور بعض ادیب اور فاضل جن پر عربیت غالب تھی اُن کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراوش کرتے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور رجاد و پیدا کرنا اور اس کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہوا تھا۔ خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانے تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامر کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ ۵۵۱ھ میں قاضی حمید الدین ابوبکر نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقاماتِ حمیدی لکھی ہے۔ اُس میں نہایت تکلّف اور تصنّع پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائعِ لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح مُقفّیٰ اور مُسجّع لکھی ہے اور جس طرح ان دونوں کتابوں میں فرضی قصّے وضع کیے گئے ہیں اُسی طرح اس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار مصنّف کے ہاتھ میں

ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا۔ اور تجنیس و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا +

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گذری ہے جس کا مصنف قابوس[1] بن سکندر ملقب بہ عنصر المعانی ہے یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے۔ اور مضامین عمدہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دلفریبی اس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی +

غرضکہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستاں کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہو۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجد تھا اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا +

اس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی نثاروں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی، یا اپنا تفلسف اور تبحر علمی جتانا، یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھکر لوگوں کا دل لبھانا۔ اور عجائبات کا طلسم باندھکر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اس نے دونوں کتابوں میں باستثناء چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کانوں سے سنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ عام حکایتیں

---

[1] یہ شخص دیالمہ آل زیار میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے جرجان اور گیلان وغیرہ میں ۴۲ برس حکمرانی کی ہے اور ۴۵۰ھ ہجری میں وفات پائی +

جو اِن کتابوں میں درج ہیں وہ اِس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بدمعاش سائل نے اپنے کو قرضدار ظاہر کرکے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکّار تھا اسکو کچھ دینا نہ چاہیے تھا۔ فرمایا اگر مکّار تھا تو مَیں اُس کے شر سے بچا ورنہ وہ اَوروں کے شر سے بچا +

یا یہ کہ ایک بادشاہزادے کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ پر گر پڑا۔ بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ +

یا یہ کہ مَیں چند درویشوں کے ساتھ رُوم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں اُترے۔ اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا +

اِن سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور اِن سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بےحقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصّہ معلوم ہوتا ہے +

گلستاں اور بوستاں کو پڑھکر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ اِن کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا۔ اُس میں کوئی نکوئی لطیف اور چبھتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حُسنِ بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلاویز طور پر بیان کرسکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو +

تعجّب ہے کہ شیخ کی گلستاں جو آیندہ نسلوں کے لیئے نثرِ فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی ایران میں اُس کے تتبّع کا کسی نے خیال نہیں کیا۔ یا یوں کہیئے کہ کسی سے اُس کا

تتبع نہیں ہو سکا - اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے بمراتب فائق تر تھا مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی +

ایران میں سب سے بڑا انشا پرداز فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانے میں ہوا ہے اُس کی مشہور کتاب تاریخ وصّاف سے بے شک اُس کا کمالِ علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے - لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجے کی استعداد کا آدمی ڈکشنری ٹٹولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر کھبے - ۷۱۲ھ ہجری میں جب کہ سلطان محمد اولجائتو خاں خدابندہ کے حکم سے آذربیجان میں شہر سلطانیہ تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی - اِس تقریب میں فضل اللہ بھی موجود تھا اور اُسی زمانے میں اُس نے تاریخ وصّاف ختم کی تھی - اِس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی - سلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا - اُس وقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبدالملک اور خواجہ اصیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور فاضل موجود تھے - فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی، خاص سلطان کے سُنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کیے - سلطان ہر فقرے کے معنی رشید الدین وغیرہم سے پوچھتا تھا - یہ لوگ اُس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا شرم سے غرماسے کچھ ہاں ہُوں کر دیتا تھا - یہ حال تاریخ وصّاف کی

عبارت کا ہے۔ اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اِسی بات میں کوشش کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور اُنکے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو۔ مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات زود فہم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کیے جائیں +

تین کتابیں میری نظر سے گذری ہیں جو شیخ کے بعد گلستاں کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبد الرحمٰن جامی کی بہارستان۔ دوسری مجد[۵۱] الدین خوانی کی خارستان۔ تیسری حبیب[۵۲] قاآنی شیرازی کی پریشان۔ سو اوّل ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اگر میری راے غلط نہو، تو خارستان کا طریقۂ تحریر اکثر جگہ اہلِ زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب دونوں کو گلستاں کے مقابلے میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کافور ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی ۔

حکایتیں اور روایتیں جو اِن کتابوں میں درج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستاں کی حکایتوں سے بہت اچھی ملتی ہیں اور زیادہ تر مجد الدین خوانی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اُسی طریقے پر مرتّب کیے ہیں۔ مگر شیخ کے حُسنِ بیان اور لطفِ ادا سے

---

۵۱ یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا۔ خواف خراسان میں ایک مشہور بستی ہے۔ کہتے ہیں کہ خارستان اُس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی +

۵۲ یہ شخص زمانۂ حال کا ایک نہایت مسلّم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہلِ ایران خاتم الشعرا سمجھتے ہیں اس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گذرے +

گلستاں نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند اس قسم کی ہم شکل اور ہم جنس کتابوں میں پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند متحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلاویز ہے اور کون سا کم۔ اس لیے چند ایک ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں، اس مقام پر نقل کی جاتی ہیں۔

گلستان اور بہارستاں کا مقابلہ

گلستاں۔ اسکندر رومی را پرسیدند کہ دیارِ مشرق و مغرب را بچہ گرفتی کہ ملوکِ پیشیں را خزائن و عمر و ملک و لشکر بیش ازیں بودہ چنیں فتحے میسر نشد۔ گفت بعونِ خدائے عز و جل ہر مملکتے را کہ گرفتم رعیتش را نیازردم و رسومِ خیراتِ گذشتگاں را باطل نکردم و نامِ پادشاہاں جز بنکوئی نبردم بیت

بزرگش نخوانند اہلِ خرد
کہ نامِ بزرگاں بزشتی برد قطعہ

ایں ہمہ ہیچ است چوں مے بگذرد
بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار
نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت پائدار

بہارستاں۔ اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی آں چہ یافتی از دولتِ سلطنت و مملکت با صغرِ سن و حداثتِ عہد۔ گفت باستمالتِ دشمناں تا از غائلۂ دشمنی زمام تافتند و از تعاہدِ دوستاں تا در قاعدۂ دوستی استحکام یافتند

بیت

بایدت ملکِ سکندر چوں فرے اقبال ہمہ
دشمناں را دوست گرداں دوستاں را دوست تر

اِن دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوقِ صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قیدِ بیان میں آسکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اِس سے محض گلستاں کی فوقیّت جتانی مقصود ہے نہ کہ بہارستان کی تنقیص کرنی:-

اوّل "اسکندر را پرسیدند" اور "اسکندر را گفتند" میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے سوال کے موقعہ پر پرسیدن بہ نسبت گفتن کے زیادہ مناسب ہے +

دوسرے شیخ کے ہاں خزائن و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں ورنہ صرف لفظِ مملکت حشو ہے اور صغرِ سن کے بعد حداثتِ عہد بھی حشو ہے +

تیسرے شیخ کے ہاں بیاں میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کمی لشکر و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجّب سے خالی نہ تھا۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی ایسی وجہ ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی سی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے +

چوتھے سکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اس میں ہرگز اِس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب ناتمام رہتا۔ اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ اِن لفظوں میں ادا ہوسکتا تھا "بہ شماتتِ دشمناں و تعاہدِ دوستاں" اِس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی +

پانچویں شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے وہ

کئی وجہ سے مولانا کے نتیجے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی۔ کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنائیگا۔ اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائیگی۔ اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا! بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جائے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا۔ نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے۔ کیونکہ سلف کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں مثمر برکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین اولوالعزم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ مُلک بہ سکندر کی خواہش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی +

گلستاں - رازے کہ نہاں خواہی با کس در میاں بہارستاں - اسرار نہانِ خود را با ہیچ دوستے
منہ اگرچہ دوست باشد کہ مر آں دوست را نیز در میاں منہ زیرا کہ بسیار بود کہ در دوستی خلل
دوستاں باشند و ہمچنیں مسلسل قطعہ افتد و بہ دشمنی بدل گردد قطعہ

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش
با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے
اے سلیم آب ز سرچشمہ ببند
کہ چو پُر شد نتواں بستن جوے

اے پسر نیکے کش از دشمن نہفتن راز ہم
بہ کہ از افشائے آں باز رستے کم نہفت
دیدہ ام بسیار کز سیر سپہر کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستاں دشمنی

بیت

سخنے در نہاں نباید گفت
کاں سخن بر ملا نشاید گفت

قطعہ

[illegible]
[illegible]
تر سم شود [illegible] انظہار آں ترا
مشکل تر از ندامت پوشیدہ داشتن

اِس مثال میں بھی گلستاں کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ہے - ۱- شیخ کہتا ہے "رازے کہ نہاں خواہی" یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اسے کسی سے نہ کہو - اور مولانا کہتے ہیں "اسرارِ نہانِ خود را" یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو - حالانکہ بعضے بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدّت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے - ۲- شیخ کہتا ہے "با کس درمیاں منہ اگر دوست باشد" - اور مولانا کہتے ہیں "با ہیچ دوستے درمیاں منہ" پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے - مگر دوسرا بیان جب تک اِس طرح نہ ہو "با دوست ہم درمیاں منہ" تب تک اُس میں تعمیم پیدا نہیں ہوتی - ۳- شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ بیان کی ہے کہ اُس کے بھی دوست ہونگے اور اُن کے دوستوں کے بھی دوست ہونگے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلا جائیگا - پس چلتے ہی چلتے راز جمہور میں پھیل جائیگا - مولانا نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شاید دوستی میں خلل آ جائے اور دوست دشمن ہو جائے - اگرچہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلا وجہ زیادہ موجّہ ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آجانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ۴- شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے بمراتب افضل اور فائق تر ہے پہلی بیت میں اُس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی نہیں ہے وہ کہتا ہے ؎

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش ... با کسے گفتن و گفتن کہ مگوے

یعنی کسی سے اپنا بھید کہکر اُس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے اِس لیے اب اُس کو ضبطِ راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا - پس اِس سے خاموشی ہی بہتر ہے - دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو

خاطر خواہ دلنشیں کیا ہے۔ مولانا کے قطعہ میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے اُسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر اُس کے ساتھ لفظِ افشا وا یہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ "ازاں دم مزنی" کی جگہ "از افشائے آں دم مزنی" کہا گیا ہے۔ اور قطعہ کا اخیر مصرعہ بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ ۵۔ قطعہ کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل ممتنع ہے یعنی۔

سخنے در خلا نباید گفت کاں سخن بر ملا نشاید گفت

یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا۔ تو نا گفتنی باتیں کہنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم خلوت میں یہ گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس سے بہتر اور سچا مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں پھر خلا اور ملا اور در اور بر کا مقابلہ اور صنعت ذو قافیتین اس کے علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی۔ مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی "مہر بسر سر بمہر کہ اُفتد بخاطرت" الخ۔

اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سربستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو۔ پھر بہیچ بیا نش نگاشتن کا لفظ "در اظہار آں" کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت تکلف ہے۔ پھر اخیر مصرعہ میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ اخفائے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی باوجود ان تمام باتوں کے دونوں شالوں میں شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلہ گلستاں کے الفاظ کے غریب معلوم

ہوتے ہیں۔ جیسے قداشت عہد۔ عائلہ۔ تعاہد۔ بموج بیانش نگاشتن۔ عزامت ۔

گلستاں اور خارستاں کا مقابلہ

گلستاں۔ حکیماں دیر دیر خورند و عابداں نیم سیر و زاہداں تا سدِ رمق و جواناں تا طبق برگیرند و پیراں تا عرق کنند اما قلندراں چنداں خورند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر سفرہ روزیِ کس۔

بیت

اسیرِ بندِ شکم را دو شب نگیرد خواب
شبے ز معدہ سنگی شبے ز دلتنگی

گلستاں۔ عالمِ ناپرہیزگار کورِ مشعلہ دار است
یہدی بہ وھو لا یہتدی

بیت

بے فائدہ ہر کہ عمر در باخت
چیزے نہ خرید و زر بینداخت

خارستاں۔ ہر کہ در گرسنگی طاقت ندارد باید کہ سہ یک شکم را از طعام پُر کند و سہ یک دیگر از آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رہا کند۔ اما صوفیانِ وقتِ ما میگویند کہ تو ہمہ شکم را از طعام پُر کن۔ آب خود چیز لطیف است خود را جائے می کند کہ لطیفاں را جائے کم نباشد و نفس را جائے گو مباش

بیت

بشنو چہ گفت صوفیِ پُرخواری
پر خور اگر سیر شدی پر اعم جواب زرد

خارستاں۔ علم با عمل ہمچو طعام با نمک است ہر کرا ہر دو ہست حکمتے تمام دارد۔ و طعامِ بے نمک را چہ تواں خورد

بیت

عمل بے علم نامضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

مذکورۂ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خارستاں کی عبارت گلستاں کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور

بے وقعت ہے اِسی لیے ہم اِس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے ◆

پریشان کا مصنف مرزا حبیب قاآنی کتاب مذکور کے خاتمے کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اُس کی عمر تیس برس سے بھی دو تین برس کم تھی، جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے اور شیخ نے گلستاں کو سنِ کہولت اور اوائل سنِ شیخوخت میں مرتّب کیا ہے۔ پس اگر قاآنی سے گلستاں کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں، کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربہ پر ہونی چاہیے۔ شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان ناتجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاآنی سے گلستاں کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا۔ کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشنے کے سوا حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر بیانِ حقایق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا ◆

قاآنی نے بھی گلستاں کی طرح پریشاں کی عبارت دلچسپ اور دلآویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سوا اِس کے کہ تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند لفنگوں اور بے باک نوجوانوں کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیا کر دیا۔ اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمۂ کتاب کے سوا جس میں اُس نے ابنائے ملوک کے لیے پند نامہ کرکے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں۔ تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اِنہایت غلیظ فحش یا خفیف ہزل پر رکھتا ہے جن کے پڑھنے سے شرم آتی ہے اور خطرہ ہے کہ پھر اُس سے

نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشاں کا خاتمہ جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے۔ باب ہشتم گلستاں کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاذونادر کوئی مضمون ایسا ہوگا۔ جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بیشک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا نشان کہیں نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قبیل کی ہیں۔

پند بادشاہ باید بسخن سخن چیناں اعتماد نکند۔ پند بادشاہ باید دیں را توقیر کند و دشمنانِ دیں را تحقیر فرماید۔ پند بادشاہ باید از خدا غافل نماند تا خدائے از و غافل نباشد۔ پند بادشاہاں را در نظامِ ممالک دست دُر افشاں بکار است و تیغ سر افشاں بیت

تا کہ بداں دوستاں شوند فراہم   تا کہ بدیں دشمناں شوند پریشاں

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں حقیقت سے دُور جا پڑتا ہے۔ مثلاً پند بادشاہ باید تواضع کند و تکبر نفرماید کہ تواضع صفتِ اتقیاست و تکبر صفتِ اشقیا و من گفتہ ام اہلِ تکبر را در نطفہ غش است چہ سرکشی صفتِ آتش است و شیطاں از آتش است اہلِ تواضع را نطفہ پاک است چہ افتادگی صفتِ خاک است و آدم از خاک بود +

اس پند کے پہلے حصّے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصّے میں جو اس نے ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوستاں میں اس طرح بیان کیا ہے :-

زخاک آفریدت خداوند پاک   پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

حریص و جہاں سوز و سرکش مباش   زخاک آفریدت آتش مباش

چو گردون کشید آتشِ ہولناک ۔۔۔ بہ بیچارگی تن بینداخت خاک

چو آں سرفرازی نمودایں کمی ۔۔۔ ازاں دیو کردند ازیں آدمی

البتہ جو عذر کہ قاآنی نے پریشاں کے دیباچے میں کیا ہے اور گلستاں کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستاں کی قدرشناسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے پریشاں کے لکھنے پر قلم اُٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ تم گلستاں کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ مَیں نے کہا۔ بھائی توبہ کر! مَیں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مُسیلمہ نے نبوّت کا دعوےٰ کرکے کذّاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا۔ مَیں نے مانا کہ جگنو رات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاند کی برابری کر سکتا ہے؟ شیخ کی گلستاں ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتّی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہلِ معنی کی جان قیامت تک اُس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اُس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبور کچھ نظم و نثر اور جِدّ و ہزل ترتیب دی گئی۔ اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پروانہ میں شہباز کی برابری نہیں کر سکتی لیکن اُس کو بھی چار و ناچار اُڑنا ہی پڑتا ہے۔"

اب ہم چند ایسے فقرے گلستاں اور پریشاں سے انتخاب کرکے لکھتے ہیں جو مُتّحدُ المضمون ہیں:

گلستاں اور پریشاں کا مقابلہ

گلستاں۔ اے فرزند دخلِ آبِ روان است خرجِ آسیائے گرداں یعنی خرج فراواں کردن مسلّم

پریشاں۔ دخل سرچشمہ است مخارج جوئے چند کہ آب سرچشمہ در انہا جاری است۔ ولاشک چوں

کسے را است کہ دخلے معین دارد۔

قطعہ

چو دخلت نیست خرچ آہستہ ترکن
کہ مے گویند ملاحاں سرودے
اگر باراں بکوہستاں نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

سرچشمہ مسدود شود جوئہا خشک شود پس ہرکس
آب در جو جاری خواہد سرچشمہ را رعایت کند۔
ایضاً خرچ باندازۂ دخل باید کرد نہ آنکہ خرچ معلوم
باشد و دخل موہوم چہ ایں معنی بغایت نامعقول
است کہ یار درپیشِ قدم و بارگیر در حیز عدم باشد۔

قطعہ۔ الا اے آنکہ خرجت ہست موجود
بکارت مے نیاید دخلِ معدوم
شنید ستی کسے از بہر جولاں
نشیند بر فرازِ اسپ موہوم

اِس مثال میں گلستاں سے صرف ایک عبارت اور پریشاں کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان قاآنی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ ہے۔ لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں اُن کا بیان کرنا اوّل تو مشکل ہے۔ دوسرے یہ اُمید نہیں کہ ناظرین اُس کو غور سے دیکھیں گے۔ اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین مقتضائے مقام ہے۔ ایک تو اظہارِ شفقت جو ناصح کے لیے ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتانا کہ نوجوان ہی اکثر اِس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل و خرچ کی تشبیہ آبِ رواں اور پن چکی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر نرالی ہے اُسی قدر سچی تُلی بھی ہے۔ پن چکی بھی بدون آبِ رواں کے نہیں چلتی اور خرچ بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا۔ پن چکی بھی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے۔

تو اس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے۔ خرچ بھی جو بدون آمدنی کے انذرنہ وغیرہ سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائدار ہوتا ہے۔ پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے شیخ نے اِن مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے یعنی خرج فراواں کردن مُسلّم کسے راست کہ دخلے معیّن دارد۔" اس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت بدیہی مثال دیکر بے بُنیاد خرچ کا مآل ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اس مقولے کو ملاّحوں کی طرف منسوب کر کے یہ جتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملاّحی گیتوں میں گائی جاتی ہے +

قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ دی ہے۔ تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے۔ مگر شیخ کی اُس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اُس نے قطعہ میں بیان کی ہے۔ لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اُس کو ملاّحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔ پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سرچشمہ کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدّت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ نے لکھا ہے۔ پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساکِ باراں کی طرف مُستند کیا ہے اور یہ کہا ہے "اگر باراں بکوہستاں نہ بارد" اور قاآنی کہتا ہے جو شخص ندّی جاری رکھنی چاہے وہ سرچشمہ کی خبر رکھے یعنی اُس کو بند نہ ہونے دے حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ پھر قاآنی نے تمثیل سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص ندّی کا جاری رکھنا چاہے وہ سرچشمہ کی خبر رکھے اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن اس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اس کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرچ جاری

رکھنا چاہیے اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ تمثیل اسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی
ہے نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رہنا چاہو تو سرچشمہ کی خبر رکھو۔
دوسری عبارت کو قاآنی نے اس جملے سے شروع کیا ہے "خرچ باندازۂ دخل باید کرد" آگے
بعد وہ کہتا ہے "نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم" یہ دوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام
کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے۔ کیونکہ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن و عید
وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لیکر خرچ کر لیا کرتا تھا
ورنہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا "نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار" یا "دخل
ہیچ باشد و خرج دہ" یا اسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم
مخالف یہی مضمون ہو سکتا ہے اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ہے۔ کیونکہ
دخل موہوم کی اُمید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں
ہے۔ تمام تاجر اور کاشتکار اور مدبرانِ ملک دخل موہوم ہی کے بھروسے پر لاکھوں کھربوں
خرچ کرتے ہیں۔ پھر ایسے خرچ کو جو دخل موہوم کی اُمید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے
پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ معدوم گھوڑے پر بیشک کوئی سوار
نہیں ہو سکتا۔ لیکن دخل موہوم کی اُمید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ہزاروں آدمی
خرچ کر سکتے اور کرتے ہیں ٭

گلستاں۔ خشم بیش از حد گرفتن وحشت آرد
و لطفِ بے وقت ہیبت ببرد، نہ چنداں
درشتی کن کہ از تو سیر گردند و نہ چنداں
نرمی کہ بر تو دلیر۔

پریشاں۔ کسانیکہ ظرافت و شوخی بسیار کنند
با لطافت رقیق القلب و وسیع الخلق باشند سزاوار
و سالاری لشکر را نشایند۔ چہ ایں صفت موجب
جسارت لشکریاں شود و گاہ باشد کہ ہرچہ گوید

ابیات

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است
درشتی نگیرد خردمند بیش
نہ سستی کہ نازل کند قدر خویش

نظم

جوانے با پدر گفت اے خردمند
مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند
بگفتا نیک مردی کن نہ چنداں
کہ گردد چیرہ گرگ تیز دنداں

بہ ظرافت و شوخی حمل کنند و نیز اندک مہربانی د
وسعت خلق لازم است کہ لشکریان بہم جستن د
بستن تنہا شدہ دور نیست کہ از بیم چشم د گوش حقوق
نعمت پادشاہ فراموش کنند و در مخالفت بہم دل
شوند و در وقت کار سستی کنند تا کار فاسد شود مثنوی

کسے را کہ شد حکمراں بر سپاہ
دو خصلت ہمیداشت باید نگاہ
عتابے نہاں اندرو صد خطاب
خطابے نہاں اندرو صد عتاب
بہر نوش او نیش ہا جاں گداز
بہر نیش او نوشہا دلنواز
بیک دست شمشیر زہر آبدار
بیک دست دریائے گوہر نثار

اس مثال میں گلستاں اور پریشاں کے مضمون میں کسی قدر فرق ہے گلستاں میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ اور پریشاں میں لشکر کے افسروں رسالداروں کی تخصیص ہے اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ نفس مضمون متحد ہے اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معنیً قاآنی کے بیان سے بمراتب فائق تر ہے۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے جو قاآنی کے فقروں میں نہیں ہے نثر میں ایسا تناسب بغیر اسکے

معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے۔ پرلے درجے کا کمال انشا پردازی اور اعلےٰ سے اعلےٰ رتبہ کی شاعری ہے شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو ان سے اور زیادہ رونق ہو گئی ہے۔ یعنی خشم اور لطف بیش از حد اور بے وقت۔ وحشت اور ہیبت آرد اور بے ہیبرد۔ درشتی اور نرمی کو جو فصّاد کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے۔ اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنا لینا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتن سے مستفاد ہوتا ہے اچھّا نہیں کیونکہ عقلمند ایسا نہیں کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھّا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کو کہ نیکی بے محل کرنی نہیں چاہیے، کیسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ متناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ قاآنی کی نثر میں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی خوبی جو قابلِ ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشاں کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ؁

آب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستاں کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی

لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی اور اُردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر گلستاں کے جُملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے اِن میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ ہر عیب کہ سلطاں بپسندد ہنر است۔

۲۔ ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت ؂

۳۔ حاجتِ مشاطہ نیست رُوے دلارام را۔

۴۔ ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر ؂

۵۔ ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید۔

۶۔ دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند ؂

۷۔ سرِ چشمہ شاید گرفتن بمیل
چو پُر شد نشاید گذشتن بپیل ؂

۸۔ پرتوِ نیکاں نگیرد ہر کہ بنیادش بد است ؂

۹۔ افعی را کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کارِ خردمنداں نیست ؂

۱۰۔ پسرِ نوح با بداں بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد ؂

۱۱۔ دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد ؂

۱۲۔ عاقبت گرگ زادہ گرگ شود ؂

۱۳۔ در باغ لالہ رُوید و در شورہ بوم خس ؂

۱۴۔ توانگری بدل است نہ بمال و بزرگی بعقل است نہ بسال ؂

۱۵۔ دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست ؂

۱۶۔ حسود را چہ کنم کو ز خود برنج در است ؂

۱۷۔ قدرِ عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید ؂

۱۸۔ آناں کہ غنی تر اند محتاج تر اند ؂

۱۹۔ چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار ؂

۲۰۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم ؂

۲۱۔ گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند ؂

۲۲۔ ہر کجا چشمہ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند ؂

۲۳۔ راستی موجب رضاے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست ؂

۲۴- آن را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک +

۲۵- تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

۲۶- تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مُردہ شود +

۲۷- بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است +

۲۸- دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی +

۲۹- در میر و وزیر و سلطاں را
بے وسیلت مگرد پیرامن
سگ و درباں چو یافتند غریب
ایں گریباں گرفت و آں دامن +

۳۰- خدائے راست مسلّم بزرگی و اطاعت
کہ جرم بیند و ناں برقرار می دارد +

۳۱- بنیادِ ظلم اوّل در جہاں اندک بود ہر کہ آمد
براں مزید کرد تا بدیں غایت رسید +

۳۲- ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد
ساعدِ سیمینِ خود را رنجہ کرد +

۳۳- چو کردی با کلوخ انداز پیکار
سرِ خود را بنادانی شکستی
چو سنگ انداختی بر روئے دشمن
حذر کن کاندر آماجش نشستی +

۳۴- کس نیاموخت علمِ تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد +

۳۵- دریاب کنوں کہ نعمتت ہست بدست
کایں دولت و ملک می رود دست بدست +

۳۶- گر وزیر از خدا بترسیدے
ہمچناں کز ملک ملک بودے +

۳۷- بر گردنِ او بماند و بر ما بگذشت +

۳۸- اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں +

۳۹- جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ +

۴۰- چو کارے بے فضولِ من بر آید
مرا در وے سخن گفتن نشاید +

۴۱- اگر روزی بدانش بر فزودے
ز ناداں تنگ تر روزی نبودے +

۴۲- محتسب را درونِ خانہ چہ کار +

۴۳- ہر کہ عیبِ دگراں پیشِ تو آورد و شمرد
بے گماں عیبِ تو پیشِ دگراں خواہد برد +

۴۴- یارِ شاطرم نہ بارِ خاطر +

۴۵- چو از قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را +

۴۶- من آنم کہ من دانم +

۴۷- گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم +

۴۸- فہمِ سخن گر نہ کند مستمع
قوّتِ طبع از متکلّم مجوے +

۴۹- خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب +

۵۰- درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار +

۵۱- نیک باشی و بدت گوید خلق
بہ کہ بد باشی و نیکت گویند +

۵۲- اگر دنیا نباشد دردمندیم
وگر باشد بہ مہرش پائے بندیم +

۵۳- درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست +

۵۴- پائے در زنجیر پیشِ دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں +

۵۵- زنِ بد در سرائے مردِ نکو
ہم دریں عالم است دوزخِ او +

۵۶- کوفتہ را ناں تہی کوفتہ است +

۵۷- او خویشتن گم است کرا رہبری کند +

۵۸- باطل است آنچہ مدّعی گوید +

۵۹- مرد باید کہ گیرد اندر گوش
ور نوشتہ است پند بر دیوار +

۶۰- خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی +

۶۱- اگر خاکی نباشد آدمی نیست +

۶۲- ہمو اگر شتاب کند بہرۂ تو نیست +

۶۳- خوئے بد در طبیعتے کہ نشست
نرود جز بوقتِ مرگ از دست +

۶۴- حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت +

۶۵- خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہرِ خوردن است +

۶۶- نہ چنداں بخور کز دہانت برآید
نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید +

۶۷- عطاے او بہ لقاے او بخشیدم

۶۸- ہر کہ ناں از عملِ خویش خورد
منتِ حاتم طائی نبرد

۶۹- گربۂ مسکیں اگر پر داشتے
تخمِ گنجشک از جہاں برداشتے

۷۰- مور ہماں بہ کہ نباشد پرش

۷۱- گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

۷۲- منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

۷۳- شاہد آں جا کہ رود عزت و حرمت بیند
ور برانند بقہرش پدر و مادرِ خویش

۷۴- بہ از روے زیباست آوازِ خوش
کہ ایں حظِ نفس است و آں قوتِ روح

۷۵- رزق ہر چند بے گماں برسد
شرطِ عقل است جستن از درہا

۷۶- بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند

۷۷- مورچگاں را چو بود اتفاق
شیرِ ژیاں را بدرانند پوست

۷۸- صیاد نہ ہر بار شکارے ببرد
باشد کہ یکے روز پلنگش بخورد

۷۹- گاہ باشد کہ کودکے ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے

۸۰- گردنِ بے طمع بلند بود

۸۱- ایں شکمِ بے ہنر پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

۸۲- یکے نقصانِ مایہ دوم شماتتِ ہمسایہ

۸۳- اگر از ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

۸۴- مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

۸۵- تو براوجِ فلک چہ دانی چیست
چوں ندانی کہ در سراے تو کیست

۸۶- گر تو قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

۸۷- چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

۸۸- نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن بجاے نیک مرداں

۸۹- سرِ ماندازی سرِ خویش گیر

۹۰- ناز بر آں کن کہ خریدار تست +

۹۱- خطائے بزرگاں گرفتن خطاست +

۹۲- چوں مخبط شد اعتدالِ مزاج
نہ عزیمت اثر کند نہ علاج +

۹۳- جواں اگر تیرے در پہلو نشیند بہ پیچے +

۹۴- تو بجائے پدر چہ کردی خیر
تا ہماں چشم داری از پسرت +

۹۵- اسپِ تازی دو تگ رود بشتاب
اشتر آہستہ می رود شب و روز +

۹۶- خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد +

۹۷- میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز +

۹۸- اگر صد عیب دارد مرد درویش
رفیقانش یکے از صد ندانند
وگر یک ناپسند آید ز سلطاں
ز اقلیمے باقلیمے رسانند +

۹۹- ہر کہ در خردیش ادب نکنی
در بزرگی صلاح ازو برخاست +

۱۰۰- ہر آں طفل کو جورِ آموزگار
نہ بیند جفا بیند از روزگار +

۱۰۱- جورِ استاد بہ ز مہرِ پدر +

۱۰۲- چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن +

۱۰۳- کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندانِ نعمت را کرم نیست +

۱۰۴- پراگندہ روزی پراگندہ دل
خداوندِ روزی بحق مشتغل +

۱۰۵- سگے را اگر کلوخے بر سر آید
ز شادی بر جہد کایں استخوان است
وگر نعشے دو کس بر دوش گیرند
لئیم الطبع پندارد کہ خوان است +

۱۰۶- ہر جا کہ گل است خار است +

۱۰۷- منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنیم
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت +

۱۰۸- نہ محقق بود نہ دانشمند
چار پائے برو کتابے چند +

۱۰۹- پیش دیوار آنچہ گوئی ہوش دار
تا نباشد در پسِ دیوار گوش +

۱۱۰- ہمہ کس را عقلِ خود بکمال نماید و فرزندِ خود بجمال +

۱۱۱- گر از بسیطِ زمین عقل منعدم گردد
بخود گماں نبرد ہیچ کس کہ نادانم

۱۱۲- کہ خبثِ نفس نگردد بسالہا معلوم

۱۱۳- درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

۱۱۴- مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ
عطار بگوید

۱۱۵- اندک اندک بہم شود بسیار

۱۱۶- کہ بسیار خوار است بسیار خوار

۱۱۷- بر رسولاں بلاغ باشد و بس

۱۱۸- کہن جامۂ خویش پیراستن
بہ از جامۂ عاریت خواستن

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر تقریباً اسی قدر اور فقرے اور اشعار گلستاں میں بھی ایسے ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستاں اور بوستاں شائع ہوئی ہیں وہاں زیادہ تر اُن کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر بازیچۂ طفلاں اور دست خوشِ کودکاں رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اُس نے اِن کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار اُن کو یاد رہ جاتے ہیں۔ پس جس قدر گلستاں اور بوستاں کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اُن میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوکِ زباں ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغرِ سن کے لذت یاب ہو چکے ہیں ورنہ اگر یہ کتابیں بھی شکسپیر پلیز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے

میں رہتیں۔ اور عورت مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ اُن کو دیکھا کرتے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ گلستاں کا ایک بڑا حصہ اور اُس سے کسی قدر کم بوستاں کے اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہوتے۔ جیسے مذکورۂ بالا فقرے اور اشعار زبانِ زد خاص و عام ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فقرہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور اندازِ بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستاں بوستاں میں خصوصاً پائی جاتی ہے ٭

یہاں ہم گلستاں کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستاں کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اُسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستاں اور اس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اسی طرح جاری ہے جیسے گلستاں کی۔ مثنوی فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا مؤثر اور پُر جوش اُس کے قلم سے تراوش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے اسی طرح اخلاق، نصیحت، پند، عشق و جوانی، ظرافت و مزاح، زہد و ریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُسکے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی

یوسف زلیخا اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے۔ شیخ نے بوستاں
میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر اعتراض
کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا ویسا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے۔
یہ قصہ نقل کرکے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم
کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام
دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں"۔ اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفاہانی کی جنگ تاتار
کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے۔ اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی
اور فصاحت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہنامہ کی نظم کے سامنے اُس کا رنگ
جمنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں
اُلفت و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مرچ جس قدر عام ہندوستانیوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے
مرغوب ہے اُسی قدر اکثر غیر ملک والوں کو خلافِ عادت ہونے کے سبب سے نامرغوب ہے۔
اکثر عطر ہم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اِسی طرح لطفِ شعر
جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر اُلفت و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دبیر کے
مرثیے جس پیرائے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ
اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے۔ یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلوار کی اور کچھ گھوڑے کی تعریف
میں لکھے جائیں۔ کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی فوقیت اوروں پر ظاہر ہو۔
یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدس میں لکھا جاوے اور مسدس اُنھیں بحروں میں سے کسی بحر میں ہو
جو انیس و دبیر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے

اُن کے بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو عربی الفاظ سے پاک ہو نظم لکھی جائے۔ اور بے شمار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرّف کیا ہے۔ اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں۔ کبھی کبھی قصداً اُسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامے میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے اشعار میں بے تکلّف داخل کیے جائیں۔ بس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شاہنامے سے میل نہیں کھاتی۔ اِس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے اِن باتوں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا۔ فردوسی نے بھی یہی گُر اختیار کیا تھا۔ جس سے اُس کی مثنوی مقبول ہوئی۔ دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتاسپ اور ارجاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آ چکی تھی۔ جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعۃً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیقی نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے۔ دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اِس حال سے واقف نہیں ہیں وہ اُس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں ٭

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً متساوی الاقدام ہیں۔ شاہنامہ۔ سکندر نامہ۔ مثنوی معنوی اور بوستاں۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کو سکندر نامہ اور بوستاں سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بے ساختہ مشق کو اُسکے بنائے ہوئے اور مرتّب کیے ہوئے قطعہ سے ہوتی ہے۔ قطعہ اگرچہ مرتّخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزا میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار

اور یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود کوشش کرے تو قطعہ میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے۔ یہی سبب ہے کہ خوشنویس لوگ اگلے اُستادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسی اور مولانا رومؒ نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامیؒ اور سعدیؒ کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کاٹ چھانٹ نہیں کی مگر باوجود اس کے صدہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے +

بوستاں اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح اور تہذیب اور زرحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعرانہ کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ۔ زورِ بیان۔ شوکتِ الفاظ۔ طرفگیٔ استعارات۔ تنوعِ تمثیلات۔ ایک ایک مطلب نئے نئے اُسلوب سے ادا کرنا۔ ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بوستاں میں نہایت سادگی۔ الفاظ کی نرمی اور گھلاوٹ۔ ترکیبوں کا سلجھاؤ۔ بیان کی صفائی۔ عبارت کی دلنشینی۔ خیالات کی ہمواری۔ مبالغے میں اعتدال۔ ماخذ میں سہولت۔ حسنِ ترتیب۔ لطفِ ادا۔ تمثیلات کی برجستگی۔ استعارات کی لطافت۔ کنایات کی شوخی۔ باوجود صنعتِ شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے +

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے۔ مولانا نظامی

سکندر نامے میں اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

فلک در بلندی زمیں در مغاک | یکے طشت خوں شد یکے طشتِ خاک
نبشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت | زخونِ سیاوش بسے سرگذشت
زمیں گر بضاعت بروں آورد | ہمہ خاک در زیرِ خوں آورد

یہی مطلب سکندر نامے میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :۔

کہ داند کہ ایں دخمۂ دام و دد | چہ تاریخہا دارد از نیک و بد
چہ نیرنگ با بخرداں ساختہ است | چہ گردنکشاں را سر انداختہ است

شیخ نے اسی مطلب کو بوستاں میں یوں بیان کیا ہے :۔

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک | بگوشم آمد نالۂ دردناک
کہ زنہار گر مردی آہستہ تر | کہ چشم و بناگوش و روئے ہست و سر

یہی مطلب بوستاں میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :۔

دریں باغ سروے نیامد بلند | کہ بادِ اجل بیخش از بن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت | کہ چندیں گل اندام در خاک خفت

قناعت کی ترغیب سکندر نامے میں اس طرح دی ہے :۔

تو نیز از تہی بارِ گردن ز دوش | زگردن کشاں بر نیاری خروش
چو دریا بہ سرمایۂ خویش باش | ہم از بودِ خود سودِ خود بر تراش
بہ مہمانیِ خویش تا روز مرگ | درختے شو از خویشتن ساز و برگ
چو پیلہ ز برگِ کساں خوردگاز | ہمہ تن شد انگشت و فے کرد باز

بوستاں میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے :۔

شنیدی کہ در روزگارِ قدیم | شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
بہ پنداری ایں قول معقول نیست | چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست
چو طفل اندروں دارد از حرص پاک | چہ مُشتِ زرش پیش و چہ مُشتِ خاک
خبر دہ بدرویش سُلطاں پرست | کہ سُلطاں ز درویش مسکیں تر است
گدا را کند یک درم سیم سیر | فریدوں بملکِ عجم نیم سیر
گدائے کہ بر خاطرش بند نیست | بہ از پادشاہے کہ خرسند نیست
بخسپند خوش رُوستائی و جُفت | بہ ذوقے کہ سُلطاں در ایوان نخفت

مآل اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامے میں اس طرح کی گئی ہے :۔

بیفگن گول گرچہ بار آیدت | کہ ہنگامِ سرما بکار آیدت
خرے بر کرایہ ز سختی بمُرد | کہ از کاہلی جُل با خود نبُرد

یہی مضمون بوستاں میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :۔

بُرِ ختر چہ خوش گفت با نوے دِہ | کہ روزِ نوا برگِ سختی بنہ
ہمہ وقت پُر دار مشک و سبُوے | کہ پیوستہ در دہ رواں نیست جُوے

سکندر نامے میں عہدِ شباب پر تحسّر اس طرح کیا گیا ہے :۔

جوانی شد و زندگانی نماند | جہاں گو مماں چوں جوانی نماند
جوانی بُود خوبیِ آدمی | چو خوبی رود کے بود خرّمی
چو پے سُست و پوسیدہ شد استخواں | دگر قصۂ خوبروئی مخواں
غرورِ جوانی چو از سر گذشت | ز گستاخ کاری فرو شوے دست
بہی چہرۂ باغ چنداں بُود | کہ شمشاد با لالہ خنداں بُود

چو بادِ خزانی در اُفتد بہ باغ زمانہ دہد جائے بُلبل بہ زاغ
بود برگ ریزاں چو شاخِ بلند دلِ باغباں زاں شود دردمند
ریاحیں ز بستاں شود ناپدید درِ باغ را کس بجوید کلید
بنال اے کہن بلبلِ سالخورد کہ رخسارۂ سرخِ گل گشت زرد
دوتا شد سہی سروِ آراستہ کدیور شد از باغ برخاستہ
چو تاریخ پنجہ در آمد بہ سال دگرگونہ شد بر شتابندہ حال
سر از بارِ سنگی در آمد بہ سنگ جہاں زہ بہ تنگ آمد از راہ تنگ
فرو ماند دستم ز مے خواستن گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت گلم سرخی انداخت و زردی گرفت
ہیونِ روندہ ز رہ ماندہ باز بہ بالیں گہ آمد سرم را نیاز
ہماں بودِ چوگانیِ باد پائے بصد زخمِ چوگاں نہ جنبد ز جائے
طرب را بہ میخانہ گم شد کلید نشانِ پشیمانی آمد پدید

بوستاں میں یہی مضمون ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:-

چو بادِ صبا بر گلستاں وزد چمیدن درخت جواں را سزد
چمد تا جوان است و سر سبز خوید شکستہ شود چوں بزردی رسید
بہاراں کہ باد آورد بید مشک بریزد درختِ کہن برگِ خشک
نہ زیبد مرا با جواناں چمید کہ بر عارضم صبحِ پیری دمید
بقید اندرم جرّہ بازے کہ بود دما دم سرِ رشتہ خواہد ربود
شمارا ست نوبت بریں خواں نشست کہ ما از تنعم بشستیم دست

چو بر سر نشست از بزرگی غبار — دگر چشمِ عیشِ جوانی مدار
مرا برف بارید بر پرِ زاغ — نشاید چو بلبل تماشائے باغ
کند جلوہ طاؤس صاحب جمال — چہ می خواہی از بازِ برکندہ بال
مرا غلہ تنگ آمد اندر درو — شما را کنوں مے دمد سبزہ نو
گلستانِ ما را طراوت گذشت — کہ گلدستہ بندد چو پژمردہ گشت
مرا تکیہ جانِ پدر بر عصاست — دگر تکیہ بر زندگانی خطاست
مُسلّم جواں راست بر پائے جست — کہ پیراں برند استعانت بدست
گُلِ سُرخِ رُویم نگر زرِ ناب — فرو رفت چوں زرد شد آفتاب
ہوس پختن از کودکِ ناتمام — چناں زشت نبود کہ از پیر خام
مرا می بباید چو طفلاں گریست — ز شرمِ گناہاں نہ طفلانہ زیست
نکو گفت لقماں کہ نازیستن — بہ از سالہا بر خطا زیستن
ہم از بامداداں درِ کلبہ بست — بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست
جواں تا رساند سیاہی بنور — بَرَد پیرِ مسکیں سپیدی بگور

مذکورۂ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ سہل المأخذ ہوتے ہیں۔ وہ معنیِ مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے مشاہدے میں آتی ہیں۔ بخلاف مولانا نظامی کے کہ اُن کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں +

شیخ نے جو شاطر صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے اگرچہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسی کے بیان سے نہیں ملتا۔ لیکن مولانا نظامی کی رزم سے جس میں سادگی

کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ چند شعر اس حکایت کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:-

بوستاں

دو لشکر بہم برزدند از کمیں
تو گفتی زدند آسماں بر زمیں

ز باریدنِ تیر ہمچوں تگرگ
بہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ

بصید ہزبرانِ پرخاش ساز
کمند اژدہاے دہن کردہ باز

زمیں آسماں شد ز گردِ کبود
چو انجم درو برقِ شمشیر و خود

چو ابر اسپِ تازی برانگیختم
چو باراں بلارک فرو ریختم

سکندر نامہ

دو لشکر چو مور و ملخ تاختند
نبرد جہاں در جہاں ساختند

بہ شمشیر پولاد و تیر خدنگ
گذرگاہ بر مور کردند تنگ

کمند اژدہاے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بتاراجِ گنج

زمیں کو بساطے بُد آراستہ
غبارے شد از جاے برخاستہ

برانگیخت رزمے چو بارندہ میغ
تگرگش ز پیکان و باراں ز تیغ

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے +

شیخ علی حزیں نے جس کو ہندوستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے بوستاں کی طرز میں لکھی ہے اور اپنی عادت کے موافق اُس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں ؎

سخن سنج گر ہست ہشیار مغز
کند قوت جاں ایں گہرہاے نغز

ازیں نامہ گردوں پر آوازہ شد — روان سخن گستراں تازہ شد
نوائے کہ ایں خامہ بنیاد کرد — دل طوسی و گنجوی شاد کرد
بگوشش نظامی اگر مے رسید — سرودے ازیں خسروانی نشید
بہ تعظیم من تیغ بنہادے بخاک — کہ احسنت اے نیر تابناک
وگر سعدیٔ شہد پرور ادا — شنیدے زشور نئے من نوا
سماعش زسر عقل بردے و ہوش — زباں مہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اِس مثنوی میں بوستاں کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اس کو اپنے لیے ایک سرمایۂ ناز سمجھتا تھا۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ "بسیارے از مطالب عالیہ و سخنانِ دلپذیر دراں کتاب بسلک نظم درآمد" مگر دونوں کتابوں یعنی بوستاں اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں، ایک جاندار دوسری بے جاں۔ لفظ اچھے بیان اچھا۔ مطالب عمدہ۔ یہ سب کچھ سہی۔ مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے جو بوستاں کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے قحط کا بیان ایک جگہ بوستاں میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے۔ ہم دونوں کے اشعار اِس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرزِ بیان اور طریقۂ ادا میں ہے اُس کو بھی کسی قدر بیان کرینگے:۔

بوستاں	خرابات
۱ چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق	۱ شنیدم کہ در عہدِ بہرام گور نمود از قضا قحط سالے ظہور

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل
۲ کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

بخوشید سرچشمہ ہائے قدیم
۳ نماند آب جز آبِ چشمِ یتیم

نبودے بجز آہِ بیوہ زنے
۴ اگر بر شدے دودے از روزنے

چو درویش بے برگ دیدم درخت
۵ قوی بازواں سست و درماندہ سخت

نہ در کوہ سبزی نہ در باغ شخ
۶ ملخ بوستاں خوردہ مردم ملخ

چو صحرائے محشر زمیں تف گرفت
۲ بدریوزۂ آسماں کف گرفت

سحاب سیہ دل نشد مہرباں
۳ بحالِ لبِ تشنۂ خاکیاں

بخیلی نمود ابر بر کائنات
۴ بہ مہدِ زمیں سوخت طفلِ نبات

زخشکی در اندامِ خاکِ ددتوہ
۵ عروقِ شجر شد چو رگہائے کوہ

ز تابِ قمر و ز ندہ مہرِ بلند
۶ زمیں مجمر و دانہ بودش سپند

لبائے چو پستان بے شیر شد
۷ زخشکی چو پیکان گلوگیر شد

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعہ میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔ قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرعے میں ہوئی ہے "کہ یاراں فراموش کردند عشق" سہل ممتنع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو۔ مگر وہی مضمون دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی ویسا بیان نہ ہو سکے۔ اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب اُن سب سے علیحدہ ہے قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح

بیان کی جاتی ہے :- "ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی - آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے - ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا - لاکھو جاندار بھوک کے مر گئے" غرضکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلّے کی گرانی - پانی کی نایابی - بھوک کی تکلیف اور اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں - شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے بلیغ ہے - اس اسلوب سے اس کو یہ جتانا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی باوجود اس کے لوگ اس کو بھول گئے تھے - اور یاراں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اسی عشاق کے جرگے میں سے تھا - دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینھ نہ برسا تھا - مگر اس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے تیسرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اس سے مستثنےٰ کرنا - چوتھے شعر میں کسی کے گھر کے روزن سے باورچیخانے کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اس سے رانڈوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنےٰ کرنا - پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں - چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلےٰ درجے کا ہے - جیسا پہلا - باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو - قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا - درختوں کا سرسبز نہ ہونا - چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا - یتیموں کا رونا - گھروں میں کھانا نہ پکنا - بے وارث رانڈوں کے آہ و نالے - درختوں کا بے برگ و بار - اور غریبوں کا بے سر و سامان ہونا - پہلوانوں اور زبردستوں کا درماندہ ہو جانا - پہاڑ اور جنگل میں سبزے اور ہریاول کا

نہ رہنا۔ ٹڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا ٹڈیوں کو کھانا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر کم وبیش ظہور میں آتی ہیں +

حزیںؔ نے باوجود اس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے۔ بوستاں سے پانسو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا۔ جس کو دیکھکر جی بے اختیار پھڑک اُٹھے +

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے اُس میں کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں زمینِ تفتہ کو صحراے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الشئ بالمجہول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہلِ دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ صحراے محشر اور تمام اعتقادیات خود تمثیل کے محتاج ہیں اُن پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا بوستاں کے اِس شعر سے ماخذ ہے جو ذوالنونِ مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے ؎

خبر شد بہ مدین پس از روز بیست ۔۔۔ کہ ابرِ سیہ دل بر ایشاں گریست

مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے جس سے ترحم اور برسنا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور حزیںؔ نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے جس سے دونو معنی ویسے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اِس شعر سے ماخوذ ہے ؎

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل ۔۔۔ کہ لب تر نہ کردند زرع و نخیل

مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرتناک ہے بہ نسبت اِس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جائے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ

بہت عمدہ ہے مگر پہلا مصرعہ تکلف سے خالی نہیں۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے
کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں پس
اندام اور دو توہ کے لفظ کو افادۂ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان
ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اُس پر ڈالا جاتا تھا
وہ سپند کا حکم رکھتا تھا۔ پس فروزندہ اور بلند، جو دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں
اُنھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندہ مہر کہنے سے آفتاب کی
گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ مہر بلند، کہنے سے اُس کی گرمی کا خیال
کم ہو جاتا ہے۔ اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں۔ ساتویں
شعر کا مضمون بالکل بخلافِ عادت اور خلاف مقتضائے مقام ہے نہ قحط کا یہ
قاعدہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس
بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے ؎

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمہ کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی حزیں پر
حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اور نہ بوستاں کو خرابات سے افضل ثابت کرنا
مدِّ نظر ہے۔ کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستاں
کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی
بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلہ میں لائی جاتی ہے جو اُس سے بمراتب
افضل و فائق ہو تو اُس میں بیسیوں فروگذاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر خرابات
بوستاں کے جواب میں نہ ہوتی اور حسنِ اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں
مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزیں کے بیان میں چون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا

کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃ الورود ہیں +

اب ہم گلستاں اور بوستاں کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو اُن کے مقبول ہونے میں بڑا دخل ہے مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستاں سے اور کہیں صرف بوستاں سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائینگی +

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اِن کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ اِن میں سرتاپا اخلاق اور تہذیبِ نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک اِن کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواعظ کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا۔ اخلاق میں سیکوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستاں اور بوستاں میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اَوروں نے نہ لکھی ہو۔ مگر کوئی کتاب اِن دونوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی اِس سے ظاہر ہے کہ قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حُسنِ بیان اور لطفِ ادا پر ہے نہ کہ نفسِ مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے جو محاسن اِن کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حُسنِ معنی اور اسلوبِ بیان سے متعلق ہونگے +

۱۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز بات اِن دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ اِن کتابوں میں اِس قدر کم ہیں کہ چند مقامات استثناء کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانۂ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو اور یہ امر ایسی پُرانی کتابوں میں جن کے زمانۂ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ

گزر چکے ہیں کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے۔

مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خلاصہ ہے ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں بیچ۔ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزہ ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں۔ مثلاً شیخ بوستاں میں کہتا ہے:۔

میانِ دو کس دشمنی بود و جنگ سر از کبر بر یک دگر چوں پلنگ
ز دیدارِ ہم تا بحدّے رَماں کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسماں

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دوچار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمال نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے پس جس طرح ادنےٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً گلستاں میں ایک دولتمند بخیل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔ "مالدارے شنیدم کہ بہ بخل چناں معروف بود کہ حاتم طائی بہ سخاوت، ظاہر حالش بہ نعمتِ دنیا آراستہ وخستِ نفس در نہادش ہمچناں متمکن۔ تابجائے کہ نانے را بجانے از دست ندادے و گربۂ ابوہریرہ را بہ لقمۂ نواختے و سگِ اصحابِ کہف را استخوانے نینداختے۔ فی الجملہ کسے خانۂ اورا ندیدے در کشادہ۔ و سفرۂ اورا سر کشادہ طبیعت

درویش بجز بوئے طعامش نہ شنیدے — مرغ از پسِ نان خوردنِ او ریزہ نچیدے

ایک اَور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اِس طرح کیا ہے :-

"سہمگیں آبے کہ مُرغابی در وایمن نبود"

گر غور سے دیکھیے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی ۔

سو پرنیچرل یعنی فوق العادت باتیں اور عجیب وغریب قصّے بھی جن سے قدیم اور متوسّط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے اِن کتابوں میں بہت کم ہیں تمام گلستاں اور بوستاں میں صرف دُو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اِس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد اُن میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا ۔

علمِ اخلاق کے بعض اُصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اَب بھی چلا جاتا ہے اگر کسی کتاب میں زمانۂ حال کے فلسفۂ مسلّمہ کے برخلاف ہوں تو اُس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتّفاق ہو مثلاً شیخ کے اِس فقرے پر کہ "دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز" اکثر مشنری لوگ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہو سکتا اِس بحث کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصّہ نقل کیا ہے ۔ اُنھوں نے کہا لہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یوروپین عالم اور مشنری موجود تھے ۔ راستی اور دروغ پر ایک مضمون پڑھا گیا ۔ جس میں گلستاں کے فقرۂ مذکور کی تائید کی گئی تھی ۔ ایک پادری صاحب ، کہا مضمون عمدہ ہے ۔ مگر جس قدر اِس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے ۔ اُس میں سے ال دینا چاہیے ۔ اِس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا ۔ آخرکار ہمارے

دوست جو اِس قصّے کے راوی ہیں اُنھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اِس بحث کا محاکمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنے ذاتی اغراض کے لیے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک سچ بولنے سے بہتر ہے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے یہ مثال دی کہ ۱۸۵۷ء میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یوروپین عورتوں اور بچّوں کو ظالموں اور بے رحموں کے شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈھتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے۔ ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بیگناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک سچ بولنے سے بہتر تھا۔ اِس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکّھا گیا۔ مذکورۂ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس نے گلستاں کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

گر راست سخن باشی ودر بند بمانی ۔۔۔ بہ زاں کہ دروغت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ صورتِ مفروضہ میں بھی مقتضائے جوانمردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کرکے اپنے تئیں اُن مظلموں پر نثار کیا جائے جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے"۔ لیکن ہمارے نزدیک جبھی تک جوانمردی ہے کہ ظالموں کے مقابلے کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بیگناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہوّر اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی ÷

اسی طرح شیخ کے اِس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے ؎

شمشیر نیک ز آہنِ بد چوں کند کسے — ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بیکار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلت بدل جاتی ہے یا نہیں علمِ اخلاق کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے روشن ضمیر مؤرخ کی رائے ہے کہ حال کی سولیزیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں۔ مگر گناہ بدستور موجود ہیں۔ پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے۔ اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے۔ لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ٹلتا +

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ "یہودی کیسا ہی دولتمند ہو جائے شریف نہیں ہوسکتا" فی الواقع اس سے کمال تعصب پایا جاتا ہے مگر اس پر کوئی مہذب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔ ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے۔ آریا نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا مسلمانوں نے بھی اپنے دَور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی باایں ہمہ شائستگی و تہذیب نوبلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں +

ایک اور جگہ گلستاں میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکمائے یونان نے آدمی کا پتہ جو خاص صفات سے موصوف ہو، تجویز کیا تھا۔ مگر تجربہ کی

نوبت نہیں آئی۔ یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر شیخ اِس اعتراض سے بری ہے۔ اِس کا الزام جو کچھ ہے مجوزین پر ہے نہ اُن کی تجویز کے راوی پر۔ شیخ پر البتہ اُس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا۔ کہ وہ اُن کی تجویز کو پسند کرتا یا یہ لکھتا کہ اُس سے بادشاہ کو شفا ہوگئی۔ یا جو فرض معلّمین اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصہ اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اُس سے عمدہ برآنہ ہوتا +

بعض مُلّایانہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سُنے گئے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستاں میں کہا ہے:۔

"رہ راست برو اگرچہ دُور است زن بیوہ مکن اگرچہ حُور است"

اِس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اُس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کٹ مُلّا بیوہ کی جگہ ہیوہ[۱] بتاتے ہیں جس کے معنی انھیں کو معلوم ہیں۔ یہ ویسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستاں کوئی فقہ کا فتوے نہیں ہے کہ جس کے ہر امر و نہی کو امر و نہی مصطلح فقہا پر محمول کیا جائے۔ وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اُس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے اُس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہا نے اُس کو مباح لکھا ہو۔ کیونکہ مُباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثیبات پر ثابت ہوتی ہے +

سب سے اوّل معقول اعتراض بوستاں کی اُس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سومنات کا قصّہ لکھا ہے مگر ہم نے اس کی بابت پہلے باب میں کچھ عُذر لکھے ہیں۔

---

[۱] ہیوہ کے معنی لغت میں متجدد اور متغیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس شعر میں کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے +

جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہوسکتے ہیں +

اَمرد پرستی کا ذکر جو اِن کتابوں میں اکثر آیا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے - مگر اِس باب میں ہم نے کچھ خاتمۂ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید اِن اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہو +

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اِس کے کہ اِن کتابوں کی قدر و قیمت میں کچھ فرق آئے اور زیادہ اُن کی عظمت ثابت ہوتی ہے - کپڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اُسی قدر جلد ذرہ سے دھبّے سے مَیلا ہوتا ہے - اِن کتابوں کا بھی یہی حال ہے - یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں - اور آج کل بھی یہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے اسی طرح مشرقی سلسلۂ تعلیم کا جزو اعظم ہیں اُن کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرع کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے - مشنریوں نے صرف اِس وجہ سے کہ اِن میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئی ہیں - اور ایسے مضامین کا سلسلۂ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے برخلاف ہے - اُن پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھّا - اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے طُولانی ریویو لکھ کر چھپوائے ہیں - نیز اِس لحاظ سے کہ اِن کتابوں کو زیادہ تر صغیر سِن بچّے پڑھتے ہیں - اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے - باوجود اِن سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اِس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانۂ متوسّط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا +

دوسری عام اور بڑی خوبی جو اِن کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا انداز بیان ہے جس کا ملکہ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا - یہ بات نہ قواعدِ علم بلاغت کی پابندی

سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی اُستاد کی تعلیم سے آتی ہے۔ بلکہ جس طرح حُسنِ صُورت
اور حُسنِ سیرت قدرتی خوبیاں ہیں۔ اسی طرح حُسنِ بیان بھی ایک جبلی خاصہ ہے جس پر
اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور
کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اس کے لیے وہ ایسا دلکش اور لطیف
پیرایہ ڈھونڈھ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے
"اَلصَّمْتُ زِیْنَةُ الْعَالِمِ وَسِتْرُ الْجَاھِلِ" یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل
کی پردہ پوش۔ اس مطلب کو وہ شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے ؎

ترا خامشی اے خداوند ہوش ۔۔۔ وقار است و نااہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبتِ خود مبر ۔۔۔ وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یا مثلاً اُس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سُنتے وہ آخر کو پچھتاتے ہیں یا زک
اُٹھاتے ہیں۔ اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے "ہر کہ نصیحت نشنود سرِ ملامت شنیدن دارد"
یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شئے کی قدر اُس کے کم یاب ہونے سے ہوتی ہے۔ اس کو
وہ اس طرح لکھتا ہے "اگر شبہا ہمہ شبِ قدر بودے شبِ قدر بے قدر بودے" یا مثلاً
اُس کو یوں بیان کرنا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے۔ اس کو اس
طرح بیان کرتا ہے "ہر کہ با داناتر از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ داناست بدانند کہ نادان است"
یا مثلاً اس مطلب کو کہ سب پیٹ کی خاطر سختی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اس عنوان سے بیان کرتا
ہے "اگر جورِ شکم نہ بودے ہیچ مرغ در دام نیفتادے بلکہ صیّاد خود دام نہ نہادے" یا مثلاً یہ
بات کہ حاکم رشوت سے دھیما ہو جاتا ہے۔ اس طرح بیان کرتا ہے "ہمہ کس را دندان بترشی
کُند گردد مگر قاضیاں را بہ شیرینی" یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذتوں کو ترک کرنا برا ہے

وہ اِس اسلوب سے ادا کرتا ہے: "ہر کہ ترکِ شہوت از بہرِ قبولِ خلق دادہ است از شہوتِ حلال در شہوتِ حرام افتادہ است"۔ یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ وزاری سے قضائے الٰہی نہیں ٹلتی اور قانونِ قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اِس کو وہ اِس طرح ادا کرتا ہے ؎

قضا دگر نشود ور ہزار نالہ و آہ — بہ شکر یا بہ شکایت بر آید از دہنے
فرشتۂ کہ وکیل است بر خزائنِ باد — چہ غم خورد کہ بمیرد چراغِ بیوہ زنے

یا اُسکو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائیگی۔ اِس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُس کو بیان کرنا ہے ایک واقعے کی صورت میں بیان کرکے اُس کو زیادہ پُرتاثیر اور دلنشیں کر دیتا ہے۔ مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزارہا اُمیدیں اور ارمان دل میں لیے ہوئے مرگئے اِسی طرح ایک روز ہم تم بھی مر جائینگے اِس مطلب کو وہ اِس طرح بیان کرتا ہے ؎

شنیدم کہ یک بار در دجلۂ — سخن گفت با عابدے کلۂ
کہ من فرِّ فرماں دہی داشتم — بسر بر کلاہِ مہی داشتم
سپہرم مدد کرد و نصرت وفاق — گرفتم بباز وے دولت عراق
طمع کردہ بودم کہ کرماں خورم — کہ ناگہ بخوردند کرماں سرم
بکن پنبۂ غفلت از گوشِ ہوش — کہ از مُردگاں پندت آید بگوش

آخر کے شعر سے اس نے یہ بات جتادی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپری نہیں بولی تھی بلکہ صرف ایک بیان کرنے کا پیرایہ ہے۔ یا مثلاً اُس کو دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق

اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ؎

یکے جہود و مسلماں خلاف می جستند | چناں کہ خندہ گرفت از نزاعِ ایشانم
بہ طنز گفت مسلماں گر ایں قبالۂ من | درست نیست۔ خدایا جہود میرانم
جہود گفت بہ توریت می خورم سوگند | وگر خلاف کنم ہمچو تو مسلمانم
گر از بسیطِ زمیں عقل منعدم گردد | بخود گمان نہ برد ہیچکس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلاویز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس پیرائے نے اس کو دلاویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصّے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دے اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ؎

دو کس گرد دیدند و آشوب و جنگ | پراگندہ نعلین و پرّندہ سنگ
یکے فتنہ دید از طرف بر شکست | یکے در میاں آمد و سر شکست
کسے خوشتر از خویشتن دار نیست | کہ با خوب و زشت کسش کار نیست

یا مثلاً اس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے ایک بڑی جواب دہی اپنے ذمّے لیتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے ؎

آں شنیدی کہ صوفیے می کوفت | زیرِ نعلینِ خویش میخے چند
آستینش گرفت سرہنگے | کہ بیا نعل بر ستورم بند

اس میں پیرایۂ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا درجے کی بھری ہے۔ یا مثلاً اس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام صرف فقیروں پر ہی نہیں بلکہ دولتمندوں پر بھی ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے

"خواہندۂ مغربی در صفِ بزّازانِ حلب می گفت اے خداوندانِ نعمت اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت رسمِ سوال از جہاں برخاستے"۔ یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ؎

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید | خجل شد چو پہناے دریا بدید
کہ جاے کہ دریاست من کیستم | گر او ہست حقّا کہ من نیستم
چو خود را بہ چشمِ حقارت بدید | صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بجاے رسانید کار | کہ شد نامور لولوے شاہوار
بلندی ازاں یافت کو پست شد | درِ نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں، اسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ؎

زاہدے در میانِ رنداں بود | زاں میاں گفت شاہدے بلخی
گر ملولی ز ما ترش منشیں | کہ تو ہم در میانِ ما تلخی

کبھی وہ اپنے ہی کلام کو اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت بامزہ کر دیتا ہے۔ جیسے ؎

دو بیتم جگر کرد روزے کباب | کہ مے گفت گویندۂ با رباب
دریغا کہ بے ما بسے روزگار | بروید گل و بشگفد نو بہار
بسے تیر و دے ماہ و اردی بہشت | بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت

یا جیسے ؎

چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن | کہ مے گویند ملّاحاں سرودے
اگر باراں بہ کوہستاں نبارد | بسالے دجلہ گردد خشک رودے

یا جیسے ؎

ہمچناں در فکرِ آں بیتم کہ گفت — پیلبانے برلبِ دریاے نیل
زیرِ پایت گر بدانی حالِ مور — ہمچو حالِ تست زیرِ پاے پیل

یا جیسے ؎

چہ خوش گفت با کودک آموزگار — کہ کارے نہ کردیم و شد روزگار

یا جیسے ؎

آں شنیدی کہ شاہدے بنہفت — با دل از دست دادۂ مے گفت
تا ترا قدر خویشتن باشد — پیش چشمت چہ قدرِ من باشد

۳۔ اِن دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور تقریباً نصف گلستاں کے فقرے مسجّع اور مقفّٰی ہیں باایں ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثرِ عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستاں کی مثال دیجاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کے کمال انشاپردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ شاعر اور منشی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اُس کے کلام میں خواہی نخواہی بناوٹ اور تکلّف پیدا ہو جاتا ہے اور سررشتۂ حُسنِ معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے شیخ نے صنائع لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنّع کا گمان نہیں ہوتا۔ مگر وہ اِن عارضی نمائشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ اُن کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے۔ جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اِس کی بھی دیدیتا ہے۔ اُس کی نثر میں مسجّع اور مرصّع فقرے سارے فقروں میں ایسے ملے ہوئے ہیں جیسے پشمینے کی شال میں ریشم کے تار۔ جب تک خاص توجّہ سے نہ دیکھا جائے

تمام فقرے یکساں اور ہموار معلوم ہوتے ہیں البتہ بعض حکایتوں میں اُس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے۔ جیسے ساتویں باب کی انیسویں حکایت جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تونگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے۔ مگر اس میں بھی الفاظ کو حسنِ معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا جس قدر اس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسنِ انتظام پایا جاتا ہے اُس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیت اور واقعیت موجود ہے۔ حکایتِ مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"تونگراں دخلِ مسکینانند۔ و ذخیرۂ گوشہ نشیناں۔ و مقصدِ زائراں۔ و کہفِ مسافراں۔ و محتملِ بارِ گراں از بہرِ راحتِ دگراں۔ دست بطعام آنگہ برند کہ متعلقاں و زیر دستاں بخورند و فضلۂ مکارمِ ایشاں بہ ارامل و ایتام و پیراں و اقارب و جیراں برسد[1]۔۔۔ از معدۂ خالی چہ قوت آید۔ و از دستِ تہی چہ مروت زاید۔ و از پائے بستہ چہ سیر آید۔ و از دستِ گرسنہ چہ خیر۔۔۔ فراغت با فاقہ نمی پیوندد۔ و جمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد۔ یکے تحریمۂ عشا بستہ و دیگرے منتظرِ عشا نشستہ این بداں کے ماند۔۔۔ اشارتِ خواجۂ عالم بفقرِ طائفہ ایست کہ مردِ میدانِ رضا اند۔ و تسلیمِ تیرِ قضا۔ نہ اینان کہ خرقۂ ابرار پوشند۔ و لقمۂ ادرار فروشند۔۔۔ مشغولِ کفاف از دولتِ عفاف محروم است۔ و ملکِ فراغت زیرِ نگینِ رزقِ معلوم۔۔۔ گفت چنداں مبالغہ در وصفِ ایشاں بکردی۔ و سخنہائے پریشاں بگفتی کہ وہم تصور کند تریاقند یا کلیدِ خانۂ ارزاق۔ مشتے متکبر و مغرور۔ و معجب و نفور۔ مشتغلِ مال و نعمت۔ و مفتتنِ جاہ و ثروت سخن نگویند الا بسفاہت و نظر نکنند الا بکراہت۔ علما را بگدائی منسوب کنند و فقرا را بہ بے سروپائی معیوب گردانند۔ بعزتِ مالے کہ دارند و غیرتِ جاہے کہ پندارند۔ برتر از

---

[1] یہ نشان ۔۔۔ اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں +

ہمہ نشینند- و خود را بہتر از ہمہ شناسند- نہ آں در سر دارند- کہ سر بکسے فرود آرند- بیخبر از قول حکما کہ گفتہ اند- "ہر کہ بطاعت از دیگراں کم است و بنعمت بیش- بصورت توانگر ست بمعنی درویش"۔ ...گفتم مذمتِ ایشاں روا مدار کہ از خداوندانِ کرم اند- گفت غلط کردی کہ بندگانِ درم اند- چہ فائدہ کہ ابرِ آذر اند و بر کس نمی بارند- و چشمۂ آفتابند و بر کس نمی تابند- بر مرکبِ استطاعت سوار اند و نمی رانند- و قدمے بہرِ خدا نہ نہند- و درمے بے منّ و اذے نہ دہند- مالے بمشقت فراہم آرند- و بخست نگہدارند و بحسرت بگذارند- چناں کہ بزرگاں گفتہ اند- "سیمِ بخیل وقتے از خاک بر آید کہ بخیل بخاک در آید"۔ ...گفتمش بر بخلِ خداوندانِ نعمت وقوف نیافتہ الّا بعلّت گدائی- وگرنہ ہر کہ طمع یکسو نہد کریم و بخیلش یکے نماید- محک داند کہ زر چیست و گدا داند کہ ممسک کیست ....محالِ عقل است کہ اگر ریگ بیاباں دُر شود- چشمِ گدایاں پُر شود .... ہرگز دیدہ دست و پائے بر کتف بستہ یا بعلّت مخنّثی در زنداں نشستہ- یا پردۂ معصومے دریدہ- یا کفے از معصم بریدہ- الّا بعلّتِ درویشی- شیر مرداں را بحکمِ ضرورت در نقب ہا گرفتہ اند و کعب ہا سفتہ .... اغلب تہیدستانِ دامنِ عصمت بمعصیت آلایند وگرسنگاں نام مردم ربایند

بیت

چوں سگِ درندہ گوشت یافت نپرسد کیں شترِ صالح است یا خرِ دجّال

....گفتا نہ من بر حالِ ایشاں رحمت می برم- گفتم نہ- کہ بر مالِ ایشاں حسرت می خوری .... ہر بیذقے کہ براندے بدفعِ آں کوشیدمے و ہر شاہے کہ بخواندے بفرزیں بپوشیدمے تا نقدِ کیسۂ ہمّت در باخت- و تیرِ جعبۂ حُجت ہمہ بینداخت .... ہر جا کہ گل است خار است و با خمر خمار- و بر سرِ گنج مار- و آنجا کہ دُرِ شاہوار است- نہنگِ مردم خوار- لذّتِ عیشِ دُنیا را لدغۂ اجل در پس است- و نعیمِ بہشت را دیوارِ مکارہ در پیش .... تطرّہ کنی در بُستاں کہ بیدِ مشک است و چوبِ خشک-

ہمچنیں در زمرۂ توانگراں شاکرند و کفور۔ و در حلقۂ درویشاں صابرند و ضجور۔... مقربانِ حضرتِ حق جلّ و علا توانگرانند درویش سیرت و درویشانند توانگر ہمت۔ مہینِ توانگراں آنست کہ غمِ درویشاں بخورد۔ و بہینِ درویشاں آں کہ کمِ توانگراں گیرد۔... نعم طائفہ ہستند بریں صفت کہ بیاں کردی۔ قاصر ہمت و کافر نعمت۔ کہ ببرند و بنہند و نخورند و ندہند۔... قومے بریں نمط ہستند کہ شنیدی۔ وطائفہ خوانِ نعمت نہادہ وصلائے کرم در دادہ و میان بخدمت بستہ۔ و ابرو بتواضع کشادہ۔ طالبِ نام اند و مغفرت۔ و صاحبِ دنیا و آخرت۔

یہ شیخ اکثر اِن کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت بلیغ کے کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حسنِ بیان سے تمام حکایت کو نہایت لطیف و ملیح کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ بالطبع ازاد کر کے اُس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تاکہ پند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور ہو جائے۔ چنانچہ گلستاں کے خاتمے میں اُس نے لکھا ہے:-

"غالب گفتارِ سعدی طرب انگیز است و طیبت آمیز۔ و کوتہ نظران را بدیں علت زبانِ طعنہ دراز کہ مغزِ دماغ بیہودہ بردن و دودِ چراغ بے فائدہ خوردن کارِ خردمنداں نیست"۔ ولیکن بر رائے روشنِ صاحب دلاں کہ روئے سخن در ایشاں است پوشیدہ نماند کہ دُرِ موعظت ہائے شافی در سلکِ عبارت کشیدہ است و داروئے تلخِ نصیحت بشہدِ ظرافت آمیختہ تا طبع ملولِ انساں از دولتِ قبول محروم نماند"۔ جو ظرافت اُس نے بوستاں اور گلستاں میں برتی ہے وہ اکثر نہایت سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانونِ شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں۔ لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اُسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک

ہوتے ہیں اور جہاں مرد عورتوں کی مجالست اور اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب
ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی
چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رُک نہیں سکتی سہ

نکو رُو تاب مستوری ندارد چو در بندی سر از روزن برآرد

اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں:۔

مثال ۱۔ مہمانِ پیرے بودم در دیار بکر کہ مالِ فراواں داشت و فرزندے خوبروئے شبے حکایت کرد کہ "مرا در عمرِ خویش جز ایں فرزند نبودہ است درختے دریں وادی زیارتگاہ است کہ مرداں بحاجت خواستن آنجا روند۔ شبہائے دراز در پائے آں درخت بحق نالیدہ ام تا مرا ایں فرزند بخشیدہ" شنیدم کہ پسر بارفیقاں ہمی گفت "چہ بودے اگر من آں درخت بدانستمے کجاست تا دعا کردمے کہ پدرم زود تر بمیرد"۔ خواجہ شادی کناں کہ پسرم عاقل است و پسر طعنہ زناں کہ پدرم فرتوت لا یعقل۔ قطعہ

سالہا بر تو بگذرد کہ گذر نہ کنی سوئے تربتِ پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہماں چشم داری از پسرت

مثال ۲۔ پیرمردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ و حجرہ بگل آراستہ و بخلوت با او نشستہ و دیدہ و دل در و بستہ۔ شبہائے دراز نخفتے و بذلہا و لطیفہا گفتے، باشد کہ مؤانست پذیرد و وحشت نگیرد۔ بالجملہ شبے می گفت "بختِ بلندت یار بود و چشمِ دولتت بیدار کہ بصحبتِ پیرے افتادی، پختہ پروردہ جہاندیدہ آرمیدہ۔ نیک و بد جہاں آزمودہ۔ سرد و گرم روزگار چشیدہ کہ حقِ صحبت بداند و شرطِ مودت بجا آرد۔ مشفق و مہرباں۔ خوش طبع شیریں زباں۔ مثنوی

تا توانم دلت بدست آرم ور بیازاریم نیازارم

در چو طوطی بُود دستِ شکر خورشت — جانِ شیرین فدای پرورشت

نه گرفتار آمدی بدست جوانی مُعجب، خیره رای، سر تیز، سبک پای که هر دم هوسی پزد و هر شب جائی خسپد و هر روز یاری گیرد **قطعه**

جوانان خرّم اند و خوب رُخسار — ولیکن در وفا با کس نپایند
وفاداری مدار از بلبلان چشم — که هر دم بر گلی دیگر سرایند

بر خلاف پیران که به عقل و ادب زندگانی کنند نه بمقتضای جهل و جوانی **بیت**

ز خود بهتری جوی و فرصت شمار — که با چون خودی گم کنی روزگار

گفت چندان که برین نمط بگفتم گمان بُردم که دلش در قیدِ من آمد و صیدِ من شد ناگاه نفسی سرد از دلِ پُر درد برآورد و گفت که چندین سخن که گفتی در ترازوی عقلِ من وزن آن یک سخن ندارد که وقتی شنیده ام از قابلهٔ خویش که گفت زنِ جوان را اگر تیری در پهلو نشیند به که پیری فی الجملہ امکانِ موافقت نبود بمفارقت انجامید چون مدّتِ عدّتش بسر آمد عقدِ نکاحش بستند با جوانی تُند، ترش روی، تهیدست، بدخوی، جور و جفا می دید و رنج و عنا می کشید و شکرِ نعمتِ حق همچنان می گفت که الحمد لله از آن عذاب الیم برهیدم و بدین نعمتِ مقیم رسیدم **قطعه**

با تو مرا سوختن اندر عذاب — به که شدن با دگری در بهشت
بوی پیاز از دهنِ خوب روی — خوبتر آید که گل از دستِ زشت

مثال ۳ — مرا حاجیی شانهٔ عاج داد — که رحمت بر اخلاقِ حجّاج باد
شنیدم که بارے سگم خوانده بود — که از من بنوعی دلش مانده بود
بینداختم شانه کاین استخوان — نمی بایدم دیگرم سگ مخوان
مپندار چون سرکه خود خورم — که جورِ خداوندِ حلوا برم

قناعت کن اے نفس بر اندکے — کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش خسرو بخواہش روی — چو یک سو نہادی طمع خسروی

یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرعے میں حکمت کا لفظ کنایۃً بجائے نفرین اور اُس کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی، قساوتِ قلبیہ وغیرہ صفاتِ ذمیمہ مسلّم ہیں۔ چنانچہ گلستاں میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ؎

از من بگوے حاجیِ مردم گزاے را — کو پوستینِ خلق بآزار می درد
حاجی تو نیستی شتر ست از برائے آنکہ — بیچارہ خار می خورد و بار می برد

ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

چوں عاملے کہ دل ز رنجانہ جمع کرد — حاجی ستم بخلق خدا بیشتر کند

بس ظاہر ہے کہ جو شوخی [illegible] کنایہ میں ہے۔ وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی۔ اکثر ناواقف لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے حقیقی معنی سے اِبا کرتا ہے ؛

مثال ۴۲۔ بازرگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بار داشت۔ و چہل بندہ خدمتگار شبے در جزیرہ کیش مرا بحجرہ خویش برد۔ و ہمہ شب نیارامید از سخنہاے پریشاں گفتن کہ فلاں انبارم بترکستان است۔ فلاں بضاعت بہندوستاں۔ و ایں قبالۂ فلاں زمیں است۔ و فلاں مال را فلاں کس ضمیں۔ گاہے گفتے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوایش خوش است۔ دباز گفتے نہ کہ دریاے مغرب مشوش است۔ سعدیا سفرے دیگر در پیش است۔ اگر آں کردہ شود بقیت عمر بگوشہ بنشینم گفتم آں کدام سفر است۔ گفت گوگرد پارسی بہ چیں خواہم بردن کہ شنیدم کہ قیمت عظیم دارد۔ و از آں جا کاسۂ چینی بروم برم۔ و دیباے رومی بہند و فولاد ہندی بحلب۔

و آبگینهٔ حلبی بیمن - و بُرد یمانی بپارس - ازاں پس ترک سفر کنم و بدکانے نشینم. برچند است که ازیں مالیخولیا فرو گفت که بیش طاقت گفتنش نماند. گفت سعدی تو هم سخنے بگو ازانها که دیدی و شنیدی - گفتم قطعه

آں شنیدستی که وقتے تاجرے / در بیابانے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیادار را / یا قناعت پر کند یا خاک گور

مثال ۵ - ملک صالح از پادشاهانِ شام / بروں آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطراف بازار و کوے / برسم عرب نیمه بربسته روے
که صاحب نظر بود و درویش دوست / هر آں کیں دو دارد ملک صالح اوست
دو درویش در مسجدے خفته یافت / پریشاں دل و خاطر آشفته یافت
شب سردشاں دیده نابرده خواب / چو حربا تأمل کناں آفتاب
یکے زاں دو می گفت با دیگرے / که در روزِ محشر بود داورے
گر ایں پادشاهانِ گردن فراز / که در لهو و عیش اند با کام و ناز
در آیند با عاجزاں در بهشت / من از گور سر برنگیرم ز خشت
بهشت برین ملک و ماوای ماست / که بندِ غم امروز بر پای ماست
همه عمر از اینان چه دیدی خوشی / که در آخرت نیز زحمت کشی
اگر صالح آں جا بدیوارِ باغ / در آید بکفشش بدرم دماغ
چو مرد ایں سخن گفت و صالح شنید / دگر بودن آں جا مصالح ندید
دمے رفت تا چشمهٔ آفتاب / ز چشم خلائق فرو شست خواب
دواں هر دو کس را فرستاد و خواند / بهیبت نشست و بحرمت نشاند

بر ایشاں ببارید بارانِ جود ۔۔۔ فرو شست شاں گردِ ذل از وجود
پس از رنج و سرما و باران و سیل ۔۔۔ نشستند با نامدارانِ خیل
گدایانِ بے جامہ شب کردہ روز ۔۔۔ معطر کناں جامہ بر عود سوز
یکے گفت از ایناں ملک زاں میاں ۔۔۔ کہ اے حلقہ در گوشِ حکمت جہاں
پسندیدگاں در بزرگی رسند ۔۔۔ ز ما بندگانت چہ آید پسند
شہنشہ ز شادی چو گل بر شگفت ۔۔۔ بخندید در روئے درویش و گفت
من آں کس نیم کز غرور حشم ۔۔۔ ز بیچارگاں روئے در ہم کشم
تو ہم با من از سر بنہ خوئے زشت ۔۔۔ کہ ناسازگاری کنی در بہشت
من امروز کردم درِ صلح باز ۔۔۔ تو فردا مکن در بروئیم فراز
چنیں راہ گر مقبلی پیش گیر ۔۔۔ شرف بایدت دستِ درویش گیر
بر از شاخِ طوبے کسے بر نداشت ۔۔۔ کہ امروز تخمِ ارادت نہ کاشت
ارادت نداری سعادت مجوے ۔۔۔ بچوگانِ خدمت تواں برد گوے
ترا کے بود چوں چراغ التہاب ۔۔۔ کہ از خود پری ہمچو قندیل زاب
وجودے دہد روشنائی بجمع ۔۔۔ کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

۵۔۔۔وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں ۔

مثال ۱۔ ہر نفسے کہ فرو می رود ممدِ حیات است و چوں بر می آید مفرحِ ذات۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است و بر ہر نعمتے شکرے واجب۔ یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں، سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت

کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے ◆

مثال ۲۔ جو نخل اندر دل دار داز حرص پاک / چہ مشت زرش پیش و چہ مشت خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس کو سونے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو برابر جاننا جو کہ اعلیٰ درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے بچے کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور ہوس پیدا نہیں ہوتی۔ پس ایک شاعرانہ فلسفی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں ◆

مثال ۳۔ ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم / وگر با چو او صد برآئی بجنگ
ازاں مار بر پائے راعی زند / کہ ترسد سرش را بکوبد بسنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زیر دست بھی زبردستوں پر غالب آ جاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ◆

مثال ۴۔ وہ کہ گر مردہ باز گردیدے / بمیان قبیلہ و پیوند
ردِ میراث سخت تر بودے / وارثاں را ز مرگ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگ خویشاوند سخت مصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا ◆

اسی طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگذشتوں سے ایسے اوراچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم وگمان میں نہیں ہوتے - مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی - ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دیکر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی - چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذراسی مٹھاس کا لالچ دیکر اُس سے لی جا سکتی ہے - پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کردیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے - یا مثلاً ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عیدگاہ میں گیا - اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے بچھڑ گیا - میں اُسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آکر دفعتہً میرا کان مروڑا اور فرمایا "میں نے تجھ کو بار ہا کہا ہے کہ میرا دامن پکڑے رہا کر مگر تو نہیں مانتا" سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا - اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا ❊ یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اُس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لینا روا نہیں ہے - یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اُمیٹھ کر کہا کہ "او نالایق! میں نے تجھ کو کلھاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی" اسی طرح زبان ذکر او شکر کے لیے بنی ہے لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی - یا ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا - دوسرے نے اُس کو جھڑک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا "، میرا دل یہ بات سُن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جا سکیں گے ❊

۶ - حسن تاویل اور لطف استدلال جیسا کہ جا بجا اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے - ایسا اور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا ❊

مثال ۱۔ شنیدی کہ در روزگارِ قدیم — شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
نہ پنداری ایں قول معقول نیست — چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

یعنی جو مشہور ہے کہ اگلے زمانے میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے۔ اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر خارقِ عادت کس حسنِ بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں، عادت کے موافق ثابت ہوتا ہے۔

مثال ۲۔ رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست — بر عارفاں جز خدا ہیچ نیست
تواں گفتن ایں با حقائق شناس — ولے خردہ گیرند اہلِ قیاس
کہ پس آسمان و زمیں چیستند — بنی آدم و دام و دد کیستند
پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند — بگویم گر آید جوابت پسند
کہ ہامون و دریا و کوہ و فلک — پری آدمی زاد و دیو و ملک
ہمہ ہر چہ ہستند زاں کمتر اند — کہ با ہستیش نام ہستی برند
عظیم ست پیشِ تو دریا بموج — بلند ست گردونِ گرداں باوج
ولے اہلِ صورت کجا پے برند — کہ اربابِ معنی بہ ملکے درند
کہ گر آفتاب است یک ذرہ نیست — و گر ہفت دریاست یک قطرہ نیست
چو سلطانِ عزت علم برکشد — جہاں سر بجیبِ عدم برکشد

یہاں اس نے وحدتِ وجود کے اصلی معنی جو کہ اہلِ نظر کی سمجھ سے بالاتر تھے نہیں بتائے بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا۔

مثال ۴۳ نگهدار فرصت که عالم دمے ست
دمے پیش دانا بہ از عالمے ست

سکندر کہ بر عالمے حکم داشت
دراں دم کہ بگذشت و عالم گذاشت

میسر نبودش کزو عالمے
ستانند و فرصت دہندش دمے

یہاں اُس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں - ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے - دوسرے یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے - پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے - کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا - نہایت عجیب کا حسنِ استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کیے جائیں اور حسنِ شعر بھی ہاتھ سے نہ جائے -

۵ - نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقع لاثانی ہے - خدا کی صنعت اور حکمت کے متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں - لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ اُن کو ویسے پاکیزہ اور دل نشین بیان کے ساتھ ادا کر سکے - اُس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے - **شعر**

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مثال ۱ - گر از حق نہ توفیق خیرے رسد
کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد

زباں را چہ بینی کہ اقرار داد
ببیں تا زباں را کہ گفتار داد

درِ معرفت دیدۂ آدمی ست
کہ بکشادہ بر آسمان و زمیں ست

کیت فہم بودے نشیب و فراز
گر ایں در نہ کردے بروے تو باز

سر آورد و دست از عدم در وجود
دریں جود بنہاد و در وے سجود

وگرنہ کے از دست جود آمدے محال است کز سر سجود آمدے
بحکمت زباں داد و گوش آفرید کہ باشند صندوق دل را کلید
اگر نہ زباں قصہ بر داشتے کس از سر دل کے خبر داشتے
وگر نیستے سعی جاسوس گوش خبر کے رسیدے بہ سلطانِ ہوش
مرا لفظ شیریں خوانندہ داد ترا سمع دراک دانندہ داد
مدام ایں دو چوں حاجباں بر دراند ز سلطاں بہ سلطاں خبر مے برند
چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست ازاں در نگہ کن کہ تقدیر اوست
برد بوستاں باں بہ ایوانِ شاہ بہ تحفہ ثمر ہم ز ایوانِ شاہ

اِس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا - اور زبان - کان - آنکھ - سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اغراض بیان کی ہیں - یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں مگر جس ترتیب سے شیخ نے اُن کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے - اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا ہے تمثیل دیکر مضمون کا حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے +

مثال ۲ - دو صد مہرہ در یک دگر ساختست کہ گل مہرہ چوں تو پرداختست
رگت در تن است اے پسندیدہ خوے زمینے در و سی صد و شصت جوے
بصر در سر و فکر و راے و تمیز جوارح بدل - دل بدانش عزیز
بہائم بروئے اندر افتادہ خوار تو ہمچوں الف بر قدمہا سوار
نگوں کردہ ایشاں سر از بہر خور تو آری بعزت خورش پیش سر

نزیبد ترا با چنیں سروری — کہ سر جز بطاعت فرود آوری

مثال ٣- شب از بہرِ آسایشِ تست و روز — مہِ روشن و مہرِ گیتی فروز

صبا از برائے تو فرّاش وار — ہمے گستراند بساطِ بہار

اگر باد و برف است و باران و میغ — وگر رعد چوگاں زند برق تیغ

ہمہ کارداران فرماں برند — کہ تخمِ تو در خاک مے پرورند

وگر تشنہ مانی ز سختی مجوش — کہ سقائے ابر آبت آرد بدوش

ز خاک آورد رنگ و بوئے و طعام — تماشاگہِ دیدہ و مغز و کام

عسل دادت از نحل و منّ از ہوا — رطب دادت از نخل و نخل از نوا

ہمہ نخل بنداں بخایند دست — ز حیرت کہ نخلے چنیں کس نہ بست

خور و ماہ و پرویں برائے تو اند — قنادیلِ سقفِ سرائے تو اند

ز خارت گل آورد و از نافہ مشک — زر از کان و برگِ تر از چوبِ خشک

بدستِ خودت چشم و ابرو نگاشت — کہ محرم بہ اغیار نتواں گذاشت

توانا کہ آں نازنیں پرورد — بہ الوانِ نعمت چنیں پرورد

بجاں گفت باید نفس بر نفس — کہ شکرش نہ کارِ زبان ست و بس

٨- وہ اکثر قانونِ قدرت سے اشیا کے حسن و قبح اور اصولِ اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسامِ استدلال کی نسبت زیادہ دلنشیں اور عام فہم ہوتا ہے۔ کلامِ الٰہی میں بھی مبدا و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے ÷

مثال ١- پلیدی کند گربہ بر جائے پاک — چو زشتش نماید بپوشد بخاک

تو آزادی از ناپسندیدہا — نترسی کہ بر وے فتد دیدہا

بلّی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اُس کو فوراً مٹی سے ڈھانک دیتی ہے۔ اِس سے وہ اِس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بُرے اعمال کو ہمیشہ لوگوں سے چھپانا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کے برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

مثال ۲۔ علم شتر جُنباں کہ معلوم است اگر طفلے مہارش گیرد و صد فرسنگ ببرد گردن از متابعت او نہ پیچد۔ امّا اگر راہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بناوانی خواہد رفتن زمام از کفش در گسلاند و بیش متابعت نکند کہ ہنگام درشتی ملاطفت مذموم است **قطعہ**

کسے کہ لطف کند با تو خاکِ پایش باش — وگر ستیزہ کند در دو چشمش افگن خاک

سخن بہ لطف و کرم با درشت خوے مگوے — کہ زنگ خوردہ نگردد بہ نرم سوہاں پاک

یہاں اُس کو یہ سوجھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے۔ اِس مطلب پر وہ یہ دلیل لاتا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اُس کی نکیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لیجاتا ہے مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اُس کی اطاعت نہیں کرتا اور رسّی تڑا کر بھاگ جاتا ہے۔

مثال ۳۔ برہ بر یکے پیشم آمد جواں — بہ تگ در پیش گوسفندے دواں

بدو گفتم ایں ریسمان است و بند — کہ مے آرد اندر پیت گوسفند

سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد — چپ و راست پوئیدن آغاز کرد

ہنوز از پیش تیز رفتن گرفت — کہ جو خوردہ بود از کفِ مرد و خوید

چو باز آمد از عیش و شادی بجاے — مرا دید و گفت اے خداوند راے

نہ ایں ریسماں مے برد با منش — کہ احساں کمندیست در گردنش

بہ لطفے کہ دیداست پیل دماں | نیارد ہمے حملہ بر پیلباں
بداں را نوازش کن اے نیک مرد | کہ سگ پاس دارد چو نانِ تو خورد
بر آں مرد کُند است دندانِ یوز | کہ مالد زباں بر پنیرش دو روز

یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کروگے اُسی قدر لوگ تمھارے دوست اور خیرخواہ و جاں نثار ہونگے پس یہ وہ دلیل لایا ہے کہ بکری - ہاتھی - کتّا - چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اُسی کا دم بھرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبُعیّت باقی نہیں رہتی ٭

۸ - وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزہ اور سامعین کے دل پر گراں ہوتی ہیں نہیں بلکہ آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں - لیکن حدِ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے اُن کو زاہد اور رند دونوں پسند کرتے ہیں ٭

مثال ا - پسر ہنگِ سُلطاں چنیں گفت زن | کہ خیز اے مبارک در رزق زن
برو تا ز خوانت نصیبے دہند | کہ فرزندگانت بسختی درند
بگفتا بود مطبخ امروز سرد | کہ سُلطاں بشب نیت روزہ کرد
زن از ناامیدی سر انداخت پیش | ہمی گفت با خود دل از فاقہ ریش
کہ سلطاں ازیں روزہ گوئی چہ خواست | کہ افطارِ او عیدِ طفلانِ ماست
خورندہ کہ خیرش برآید ز دست | بہ از صایم الدّہرِ دنیا پرست
مسلّم کسے را بود روزہ داشت | کہ درماندہ را دہد نانِ چاشت

وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری — زخود باز گیری و ہم خود خوری

مثال ۲۔ شنیدم کہ مردے براہِ حجاز — بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز

چناں گرم رو در طریقِ خدا — کہ خارِ مغیلاں نہ کندے زپائے

بہ آخر ز وسواسِ خاطر پریش — پسند آمدش در نظر کارِ خویش

بہ تلبیسِ ابلیس در چاہ رفت — کہ نتواں ازیں خوبتر راہ رفت

گرش رحمتِ حق نہ دریافتے — غرورش سر از جادہ برتافتے

یکے ہاتف از غیب آواز داد — کہ اے نیک بختِ مبارک نہاد

مپندار گر طاعتے کردۂ — کہ نزلے بدیں حضرت آوردۂ

بہ احسانے آسودہ کردن دلے — بہ از الف رکعت بہ ہر منزلے

۱۰۔ جب اُس کو کسی خاص فرقے یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ اُمرا اور دولتمندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اور ایک شخص کا جس میں اپنے تئیں امرا کا طرفدار اور اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حامی قرار دیا ہے، لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طرف ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ اور شیخ اس کی تقریر کو رد کر کے اُمرا کی خوبیاں اور درویشوں کی برائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمام سلاطینِ عہد اور وزرا اور اُمرا کی خاطر خواہ خبر لی ہے۔ چنانچہ گلستاں کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے۔ یا مثلاً اُس کو مشائخ و زہاد کی ملعی کھولنی منظور تھی اس مضمون کو اُس نے کھُلم کھُلا ادا نہیں کیا۔ بلکہ ایک قصہ جو بوستاں کے

چوتھے باب میں مذکور ہے، نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقرا اور مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے جتنے واقعی عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پتّرے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اس مقولے پر ختم کرتے ہیں ؎

"نخواہم دریں باب ازیں بیش گفت — کہ شنعت بود سیرت خویش گفت"

یعنی میں اس باب میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی "اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے" کیونکہ آپ بھی اسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور تحمّل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زباں درازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا +

۱۱- یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ اتنے مؤثّر نہیں ہوتے، جتنا کہ اپنی سرگزشت اور روداد کا بیان مؤثر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو۔ کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سُنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدّد واسطوں سے سُنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگزشت کو بہ نسبت اخبار غیر کے زیادہ پرجوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستاں اور بوستاں میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور اُن سے نتائج استخراج کیے ہیں۔ اس لیے اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ

شیخ جیسا جادو بیان اُن کو بیان کرتا ہے ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے ٭

مثال ۱۔

بصنعا درم طفلے اندر گذشت — چہ گویم کزانم چہ بر سر گذشت
قضا نقش یوسف جمالے نکرد — کہ ماہی گورش چو یونس نخورد
دریں باغ سروے نیامد بلند — کہ باد اجل بیخش از بن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت — کہ چندیں گل اندام در خاک خفت
بدل گفتم اے ننگ مردان بمیر — کہ کودک رود پاک و آلودہ پیر
ز سودا و آشفتگی بر قدش — برانداختم سنگے از مرقدش
ز ہولم دراں جائے تاریک و تنگ — بشورید حال و بگردید رنگ
چو باز آمدم زاں تغیر بہ ہوش — ز فرزند دلبندم آمد بگوش
گرت وحشت آمد ز تاریک جائے — بہش باش و با روشنائی درآے
شب گور خواہی منور چو روز — ازیں جا چراغ عمل برفروز
تن کارکن مے بلرزد ز تب — مبادا کہ نخلش نیارد رطب
گروہے فراواں طمع ظن برند — کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند
برآں خورد سعدی کہ بیخے نشاند — کسے برد خرمن کہ تخمے فشاند

۲۔ جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اچھوتے مباحث پیش نہیں کرتا۔ جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد دلاتا ہے جو اُس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اُس کو متنبہ کرنا منظور

ہوتا ہے تو ایسے صریح اور صاف نتیجے سوجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں ؔوہ
کوئی نئی بات نہیں سکھاتا۔ بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ
اُس بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھنچتے ہیں اور اُس کے کلام میں ایسا مزہ
آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت
رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے ؞

مثال ۱۔ پدر مُردہ را سایہ بر سر فگن / غبارش بیفشان و خارش بکَن
چو بینی یتیمے سر افگندہ پیش / مدہ بوسہ بر رُوے فرزندِ خویش
یتیم ار بگرید کہ نازش خرد؟ / وگر خشم گیرد کہ بارش بَرد؟
الا تا نگرید کہ عرشِ عظیم / بلرزد ہمے چوں بگرید یتیم
برحمت بکن آبش از دیدہ پاک / بشفقت بیفشانش از چہرہ خاک
اگر سایۂ او برفت از سرش / تو در سایۂ خویشتن پرورش
من آنگہ سرِ تاجور داشتم / کہ سر در کنارِ پدر داشتم
اگر بر وجودم نشستے مگس / پریشاں شدے خاطرِ چند کس
کنوں گر بزنداں برندم اسیر / نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از دردِ طفلاں خبر / کہ در طفلی از سر برفتم پدر

مثال ۲۔ پسر چوں ز دہ برگذشتش سنیں / ز نامحرماں گو فراتر نشیں
بر پنبہ آتش نشاید فروخت / کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت
چو خواہی کہ نامت بماند بجاے / پسر را خردمندی آموز و راے
کہ گر عقل و دانش نباشد بسے / بمیری و از تو نماند بسے

بسا روزگارا که سختی برد | پسر چوں پدر نازکش پرورد
خردمند و پرہیزگارش برآر | گرش دوست داری بنازش مدار
بخردی درش زجر و تعلیم کن | بہ نیک و بدش وعدہ و بیم کن
نوآموز را ذکر و تحسین وزہ | ز توبیخ و تہدید استاد بہ
بیاموز پرورده را دست رنج | وگر دست داری چو قاروں بہ گنج
مکن تکیہ بر دستگاہے کہ ہست | کہ باشد کہ نعمت نماند بدست
بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر | نہ گردد تہی کیسۂ پیشہ ور
چہ دانی کہ گردیدن روزگار | بغربت بگرداندش در دیار
چو بر پیشۂ باشدش دسترس | کجا دست حاجت برد پیش کس
ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت | نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت
بخردی بخورد از بزرگاں قفا | خدا دادش اندر بزرگی صفا
ہر آں طفل کو جور آموزگار | نہ بیند جفا بیند از روزگار
پسر را نکو دار و راحت رساں | کہ چشمش نماند بدست کساں
ہر آں کس کہ فرزند را غم نخورد | دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد
نگہدار ز آمیزگار بدش | کہ بدبخت و بے رہ کند چوں خودش
پسر کو میان قلندر نشست | پدر گو، ز خیرش فرو شوئے دست
دریغش مخور بر ہلاک و تلف | کہ پیش از پدر مردہ بہ ناخلف

یہ خصوصیتیں جو گلستاں اور بوستاں میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں مگر ہم انھیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں +

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو کہ زمانۂ فارسی اور اردو دیوانوں میں رائج ہے اس طریقے پر غالباً سب سے اول شیخ ہی کا دیوان مدوّن کیا گیا ہے۔ کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوانِ غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعۂ قصاید کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں +

علی بن احمد بے ستون جامع کلیاتِ شیخ نے اول ہر ایک غزل کے مطلع کا حرف لیکر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیبِ حروفِ تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اُس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی وفات کے بیالیس برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہوگئی +

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طیبات ہے۔ باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سنِ کہولت کے اور پیری کے زمانے کے ہیں مگر شیخ کا اندازِ بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوانِ شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سنِ کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اس سے

مستثنیٰ ہے۔ البتہ طیبات اور بدائع جو جوانی اور کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں اُن میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زورِ بیان زیادہ پایا جاتا ہے ❖

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدانِ شعرا لکھا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصاید میں بھی مثل متاخرین کے اکثر تشبیبوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی۔ جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدہ اور مثنوی پر تھا۔ بعضے دوبیتی (یعنی رباعی) اور قطعہ کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے ❖

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کر دیا کہ لوگ قصیدہ اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے۔ اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیمبر کہا ہے مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوقِ سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نمکدانِ شعرا ہے یا وہ غزل کا پیمبر ہے انھیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح مابہ الامتیاز شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزلیات کو کیا فوقیت ہے لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے ❖

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے۔ صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو یہ چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی

جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنھوں نے غزل کو نہایت بامزہ اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے +

۱- شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنّی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائیگی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیاتِ شیخ جس نے شیخ سے ۳۴ برس بعد اُس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک بلخ برات کو مجلسِ سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی ؎

نظر خدا بینان ز سرِ ہوا نباشد　　سفرِ نیازمندان ز رہِ خطا نباشد

مجلس کے خاص و عام جا بجا بیہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخاست ہونے کے بعد سب کا اِس بات پر اتفاق تھا۔ کہ مدتِ عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا +

مَیں کہتا ہوں کہ ایک بار مَیں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے ایک مطلع پر جو قوال نے بے مزامیر کے اُن کے سامنے گایا تھا دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کانپنے لگا تھا۔ اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے۔ اور یہ کیفیت اُن پر بہت دیر تک طاری رہی تھی۔ وہ مطلع یہ تھا:-

اے کہ آگاہ نۂ عالمِ درویشاں را　　تو چہ دانی کہ چہ سودا ؤ سر است ایشاں را؟

۲- شیخ کی غزل کو اُس جبلی عشق و محبت نے جو اُس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشق مزاج ہوئے ہیں

اُن کی تشبیب و تغزل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے۔ جو اَوروں کے
کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں ؎

آں کہ نشنیداست ہرگز بوئے عشق   گو بہ شیراز آ و خاکِ ما بپوے

یہی سبب ہے کہ وہ حسن و عشق۔ وصل و جدائی۔ یاس و امید۔ صبر و مجبوری۔ وعدہ
و انتظار اور دیگر لوازمِ عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل تصنع نہیں
پایا جاتا۔ اور وہ سب ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اُس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں
اسی واسطے عشّاق کے دل پر اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ایسے اشعار سے شیخ کے
چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں:

مقدارِ یارِ ہم نفس چوں من نداند ہیچ کس   ماہی کہ در خشک اوفتد قیمت بداند آب را

٥

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست   گر امیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

٥

ہر کو ہمہ عمرش سودائے گلے بودہ است   داند کہ چرا بلبل دیوانہ ہمی باشد

٥

دل و جانم بہ تو مشغول و نگہ بر چپ و راست   تا بدانند رقیباں کہ تو منظورِ منی

دیگراں چوں بروند از نظر از دل بروند   تو چناں در دلِ من رفتہ کہ جاں در بدنی

٥

گفتہ بودم کہ رخت بر بندم   تا رہِ بصرہ گیرم و بغداد

دست از دامنم نمے دارد   خاکِ شیراز و آبِ رکنا باد

٥

ہزار جہد بکردم کہ سرِ عشق بپوشم   نبود بر سرِ آتش میسّرم کہ نجوشم

بہ زخم خوردہ حکایت کنم ز دستِ جراحت   کہ تندرست ملامت کند چو من بخروشم

نفحاتِ صبح دانی زچہ رُوے دوست دارم ۔ کہ بروے دوست ماند کہ برافگند نقابے
بروا اے گداے مسکین درِ دیگرِ طلب کن ۔ کہ ہزار بار گفتی و نیامدت جوابے

شربتے تلخ ترازِ دردِ فراقت باید ۔ تا کند لذتِ وصلِ تو فراموش مرا

بر عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را ۔ از ذوقِ اندرونش پروائے دَر نباشد

برقِ یمانی بجست بادِ بہاری کجاست ۔ طاقتِ مجنوں نماند خیمۂ لیلی کجاست

۴۔ اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیت اُس کے دل پر گذری ہے اُس کو بیان کرتا ہے۔ اِس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں تا اسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے نہایت مزہ دیتے ہیں۔ مثلاً

اے رُودبہک چرا نشستی بجاے خویش ۔ با شیر پنجہ کردی و دیدی سزاے خویش

ساربان آہستہ راں کآرامِ جانم در محل است ۔ اشتراں را بار بر پشت است و ما را بر دل است

چہ رُوے است اینکہ پیشِ کارواں است ۔ مگر شمعے بدستِ ساربان است
سلیمان است گوئی در عماری ۔ کہ بر بادِ صبا تختش روان است
دررُوے کارِ من برقع برانداخت ۔ بیک بار آں کہ در برقع نہان است
شتر پیشی گرفت از من برفتار ۔ کہ بر من پیش ازاں بارِ گران است
بدار اے ساربان محمل زمانے ۔ کہ عہدِ وصل حالا آخر زمان است

یاران رفتادہ را در کارواں بگذاشتند ۔ بے وفایاراں کہ بر بستند بارِ خویش را
ہر کہ را در خاکِ غربت پاے در گل ماند ماند ۔ گو دگر در خوابِ خوش بینند دیارِ خویش را

پیوند رُوح می کند ایں بادِ مشک بیز ہنگام نوبتِ سحرست اے ندیم خیز
شاہد بخواں و شمع بسوزاں و گل بنہ عنبر بسائے و عُود بسوز اں و گل بریز

خادمۂ سرائے را گو درِ حجرہ بند کُن تا بہ سپر حضور ہا راہ نبرد مُوسوی

۴- وہ اکثر حالات و واردات کو جو اُس کے دل پر گزرتی ہیں تمثیلات میں بیان کرکے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا رُوم کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

بہ گنجِ شایگاں افتادہ بودم ندانستم کہ در گنج اند ماراں
اے برادر ما بہ گرداب اندریم واں کہ شفقت می زند بر ساحل است
رُطبِ شیریں و دست از نخل کوتاہ زلال اندر میان و تشنہ محروم
اُستاد کیمیا را بسیار زر بباید در خاک تیرہ کردن تا آنگہ زر بباشد

۵- شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر نزاکت اور چٹپٹا پایا جاتا ہے۔ جس سے قدما کی غزل مُعرا معلوم ہوتی ہے وہ ایک سیدھی سی بات کو پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرایہ میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سنگریزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گراں بہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً

بود ہمیشہ پیش ازیں رسمِ تو بیگنہ کُشی از چہ مرا نے کُشی من چہ گناہ کردہ ام
خلق را بیدار باید بود ز آبِ چشمِ من ویں عجب کاں وقت می گریم کہ کس بیدار نیست
من نہ دانستم از اوّل کہ تو بے مہر و وفائی عہد نابستن ازاں بہ کہ بہ بندی و نپائی
دوستاں عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم — شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

اِس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدما کی غزل کو ہے اُس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اِس مقام پر دو دو شعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں:-

انوری۔ رُوے چوں ماہِ آسماں داری
قد چوں سرو بوستاں داری

سعدی۔ سرو را مانی ولیکن سرو را رفتار نیست
ماہ را مانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

ایضاً۔ ہمہ با من جفا کند لیکن
بجفا ہیچ از و نیازارم

ایضاً۔ تا دری بر ہر چہ می خواہی بجز آزارِ من
زاں کہ گر شمشیر بر فرقم زنی آزار نیست

خاقانی۔ بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

ایضاً۔ ہمہ چشمیم تا بروں آئی
ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

ایضاً۔ شاد باش اے حسن خود کز وصفِ تو سحرِ حلال
طبعِ خاقانی بہ نظم آورد و دیواں تازہ کرد

ایضاً۔ ہر دم از شاخِ زبانم میوۂ تر میرسد
بوستانہا رستہ زاں تخمم کہ در دل کاشتی

۶۔ سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دیوان کو نمکدانِ شعرا کہا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامینِ مندرجۂ ذیل پر ہے۔ تصوّف اور درویشی۔ عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کے پیرائے میں ادا کرنا اور شاہدِ مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دنداں وغیرہ سے تعبیر کرنا۔ کاملین اور عرفا اور مشائخ پر، رند۔ بادہ خوار۔ میفروش۔ پیرِ خرابات کے الفاظ اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے

لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک اور فقیری کے مدارج و مقامات یعنی صبر و رضا تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محتسب و زاہد و فقیہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رُو سے محلِ ادب ہیں، طعن و تعریض کرنی اور غیر متشرع اور آزاد لوگ جو از رُوے مذہب بل قوم مس و مذمت ہیں اُن کی خوبی ظاہر کرنی۔ دُنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانا۔ ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رُسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی۔ عقل و دانش کی جا بجا توہین۔ اور عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیکر اُس کی تعریف کرنی۔ ساقی مُطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمہ کا اِس لیے طلبگار ہونا کہ دُنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ بادِ صبا اور نسیم سحری اور بوے گُل کو اکثر مخاطب کرنا۔ اور اُن کو قاصد و پیغامبر ٹھیرا کر اپنی آرزوئیں اور مُرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں۔ مثلاً عشقِ حقیقی کی واردات اور کیفیات عشقِ مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی۔ اور زلف و خال و خط سے شاہدِ مطلق کی شیون اور صفات مُراد لینی زیادہ دلکش اور مؤثر ہیں بہ نسبت اِسکے کہ کھُلی سُور ٹھ گائی جائے یعنی عشقِ حقیقی کو صاف صاف اِس طرح بیان کیا جاے جیسے ادنے درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مُناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں حضرت مولانا مخدوم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں ۔۔۔ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اِسی طرح واعظ و زاہد۔ شیخ۔ قاضی۔ صوفی۔ محتسب اور ایسے اشخاص کو جن کی

مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے۔ ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے
تاڑنا اور رند و آوباش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف باطنی، آزادگی
اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اِس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور
متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزیدار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے +

اگرچہ اِن میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدما کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں
لیکن شیخ کے ہاں اوّل تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حسنِ بیان نے
اُن کو بہت بامزہ اور لطف انگیز کر دیا ہے +

شیخ کے بعد اوّل حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں
شیخ کا تتبع کیا ہے۔ کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے
ملتان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی ہی زندگی میں
بھیج دیے تھے۔ اُس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری
میں ترقی کرنے کے لیے اُن کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصنافِ
سخن میں جیسا کہ مثنوی نُہ سپہر[1] میں لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے مگر شیخ
کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت — شیرہ از خمخانۂ مستے کہ در شیراز بود

---

[1] نُہ سپہر کے اشعار یہ ہیں:-

کس نہ بیند سوے تعلیم دگیر — کہ نہ گردد بہ دے منزل گیر
چوں نماند بہ دل خلقے یاد — گرچہ شد زادہ ہمساں داں کہ نزاد
تا بجائے کہ حسد بار سیاں — اندریں عہد دو تن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و ثانیش ہمام — ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوے دگر یاری دست — شعرِ شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانے کی غزلوں کا نام غزلیاتِ قدیم اور جوانی اور کہولت کی غزلیات کا نام طیبات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں۔ تحفۃ الصغر، واسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ۔ ان دیوانوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیرازی نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر انھیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اوّل شیخ نے چمکا دیا تھا۔ مگر ان میں بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انھیں کا حصہ ہو گئے ہیں۔ جیسے تصوّف۔ شراب۔ اہلِ ظاہر پر خردہ گیری۔ دنیا کی بے ثباتی۔ عقل و تدبیر کی توہین۔ عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں جن میں مضامین مذکورۂ بالا زیادہ باندھے گئے ہیں:۔

برخیز تا یکسو نہیم ایں دلقِ ازرق فام را — بر بادِ قلاشی دہیم ایں شرکِ تقویٰ نام را

مے با جواناں خوردنم خاطر تمنا مے کند — تا کودکاں در پے فتند ایں پیرِ دُرد آشام را

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بصحرا مے کشد — کز بوستاں بادِ سحر خوش مے دہد پیغام را

غافل مباش ار عاقلی دریاب گر صاحبدلی — باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنیں ایام را

جائے کہ سروِ بوستاں با پائے چوبیں مے چمد — ما نیز در رقص آوریم آں سروِ سیم اندام را

وقتِ طرب خوش یافتم آں دلبرِ طناز را — ساقی بیار آں جامِ مے مطرب بزن آں ساز را

امشب کہ بزمِ عارفاں از شمعِ رویت روشن است — آہستہ تا نبود خبر رندانِ شاہد باز را

رُوئے خوش و آوازِ خوش دارند ہر یک لذّتے ٭ بنگر کہ لذّت چوں بود محبوبِ خوش آواز را

٭

جاں ندارد ہر کہ جانانیش نیست ٭ تنگ عیش است آں کہ بستانیش نیست

گر دلے داری بہ دلدارے سپار ٭ ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق ٭ گفت معزول است فرمانیش نیست

دردِ عشق از تندرستی خوشتر است ٭ گرچہ غیر از صبر درمانیش نیست

چناں بموئے تو آشفتہ ام ببوئے مست ٭ کہ نیستم خبر از ہر چہ در دو عالم ہست

دگر بروئے کسم دیدہ برنمے باشد ٭ خلیلِ من ہمہ بت ہائے آزری شکست

غلامِ ہمتِ آنم کہ پائے بندِ یکے است ٭ بجانبے متعلق شد از ہزار برست

نگاہِ من بہ تو و دیگراں بہ تو مشغول ٭ معاشراں ز مے و عارفاں ز ساقی مست

برادراں و عزیزاں نصیحتم مکنید ٭ کہ اختیارِ من از دست رفت و تیر از شست

٭

خوشتر از دورانِ عشق ایام نیست ٭ بامدادِ عاشقاں را شام نیست

مطرباں رفتند و صوفی در سماع ٭ عشق را آغاز ہست انجام نیست

از ہزاراں در یکے گیرد سماع ٭ زاں کہ ہر کس محرمِ پیغام نیست

ہر کسے را نامِ معشوقے کہ ہست ٭ مے برد معشوقِ ما را نام نیست

بادِ صبح و خاکِ شیراز آتشے است ٭ ہر کہ او در وے گرفت آرام نیست

سعدیا چوں بت شکستی خود مباش ٭ خود پرستی کمتر از اصنام نیست

٭

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ ست ٭ ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ ست

برادرانِ طریقت نصیحتم مکنید ٭ کہ توبہ در رہِ عشق آبگینہ و سنگ ست

دگر بخفیہ نمی بایدم شراب و سماع ٭ کہ نیک نامی در دینِ عاشقاں ننگ ست

چه تربیت شنوم یا چه مصلحت بینم ‌ ‌ ‌ ‌ مرا که چشم بساقی و گوش بر چنگ ست
بخشم رفتهٔ ما را که مے بَرد پیغام ‌ ‌ ‌ ‌ بیا که ما سپر انداختیم گر جنگ ست
بیادگارِ کسے دامنِ نسیم صباح ‌ ‌ ‌ ‌ گرفته ایم و چه حاصل که باد در چنگ ست
بکش چناں که تو دانی که بے مشاهده ات ‌ ‌ ‌ ‌ فراخناے جهاں بر وجود ما تنگ ست
ملامت از دلِ سعدی فرو نشوید عشق ‌ ‌ ‌ ‌ سیاهی از حبشی چوں رَوَد که خود رنگ ست

دوش بے روے تو آتش بسرم بر می شد ‌ ‌ ‌ ‌ آبم از دیده همی رفت و زمیں تر می شد
تا بافسوس بپایاں نرود عمرِ عزیز ‌ ‌ ‌ ‌ همه شب ذکر تو می رفت و مکرر می شد
چشمِ مجنوں چو بخفتے همه لیلی دیدے ‌ ‌ ‌ ‌ مُدعی بود اگرش خواب مُیسر می شد
یارب آں صبح کجا رفت که شبهاے دگر ‌ ‌ ‌ ‌ نفسے مے زد و آفاق منور می شد
سعدیا عقدِ ثریا مگر امشب بگسیخت ‌ ‌ ‌ ‌ ورنه هر شب ز گریبانِ سحر بر می شد

متقلب درونِ جامهٔ ناز ‌ ‌ ‌ ‌ چه خبر دارد از شبانِ دراز
جهد کردم که دل بکس ندهم ‌ ‌ ‌ ‌ چوں تواں کرد با دو دیدهٔ باز
محتسب در قفاے رنداں ست ‌ ‌ ‌ ‌ غافل از صوفیانِ شاهد باز

از تو با مصلحتِ خویش نمے پردازم ‌ ‌ ‌ ‌ همچو پروانه که مے سوزم و در پروازم
گر تو خواهی که بجوئی دلم امروز بجوے ‌ ‌ ‌ ‌ ورنه بسیار بجوئی و نیابی بازم
من خراباتی و دیوانه ام و عاشق و مست ‌ ‌ ‌ ‌ بیشتر زیں چه حکایت بکند غمّازم
ماجراے دلِ دیوانه بگفتم بطبیب ‌ ‌ ‌ ‌ که همه شب در چشم ست بفکرت بازم
گفت زیں نوع حکایت که تو داری سعدی ‌ ‌ ‌ ‌ دردِ عشق ست ندانم که چه درماں سازم

برخیز تا طریق تکلف رها کنیم ‌ ‌ ‌ ‌ دکّانِ معرفت بدو جو بر بها کنیم

گر دیگر آں نگارِ قباپوشش بگذرد ‏— ما نیز جامہ ہائے تصوف قبا کنیم

°

ساقیا مے دہ کہ ما دُردی کشِ میخانہ ایم ‏— با خرابات آشنائیم از خرد بیگانہ ایم

خویشتن سوزیم و جاں بر سر نہادہ شمع وار ‏— ہر کجا در مجلسے شمعے ست ما پروانہ ایم

اہلِ دانش را دریں گفتار با ما کار نیست ‏— عاقلاں را کے زیاں دارد کہ ما دیوانہ ایم

خلق مے گویند جاہ و فضل در فرزانگی ست ‏— گو مباش اینہا کہ ما رندانِ نافرزانہ ایم

عیب بتست ار چشمِ گوہر بیں نداری ورنہ ما ‏— ہر یکے اندر بحرِ معنی گوہرِ یکدانہ ایم

°

دو چشمِ مست میگونش ببُرد آرامِ ہشیاراں ‏— دو خواب آلودہ بربودند عقل از دستِ بیداراں

نصیحت گوئے راز من بگو اے خواجہ دم درکش ‏— کہ سیل از سر گذشت آں را کہ می ترسانی از باراں

چہ بوئے ست آنکہ عقل از من ببُرد و صبر و ہشیاری ‏— ندانم باغِ فردوس ست و یا بازارِ عطاراں

تو با ایں مردمِ کوتہ نظر در چاہِ کنعانی ‏— بمصر آ تا پدید آیند یوسف را خریداراں

°

اے کہ ز دیدہ غایبی در دلِ ما نشستۂ ‏— حسنِ تو جلوہ می کند ویں ہمہ پردہ بستۂ

خاطرِ عام بُردۂ خونِ خواص خوردۂ ‏— با ہمہ صید کردۂ خود ز کمند جستۂ

°

مے برزند ز مشرق شمعِ فلک زبانہ ‏— اے ساقئ صبوحی دردہ مئ شبانہ

عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش ‏— ہوشم ببر زمانے تا کے غمِ زمانہ

صوفی چگونہ گردد گردِ شرابِ صافی ‏— گنجشک را نگنجد عنقا در آشیانہ

آں کوزہ بر کفم نہ کآبِ حیات دارد ‏— ہم طعمِ نار دارد ہم رنگِ ناردانہ

گر مے بجاں دہندت بستاں کہ پیشِ دانا ‏— ز آبِ حیات خوشتر خاکِ شرابخانہ

°

ہر روز بادِ مے بَرد از بوستاں گُلے ‏— مجروح مے کند دلِ مسکینِ بلبلے

زودے ست ما و پیکرِ دموے ست شکیبے ‏— ہر لالۂ کہ مے دمد از خاک و سُنبلے

بالاے خاک ہیچ عمارت نکردہ اند — کزوے بدیر و نرود نباشد تحوّلے
نکردہ طلعتے ست جہانِ فریب ناک — ہر بامداد کردہ بہ شوخی تجمّلے
دی بوستان خورم و صحرا و لالہ زار — و نہ بانگ مرغ در چمن اُفتادہ غلغلے
وامروز خارہاے مغیلاں کشیدہ تیغ — گوئی کہ خود نبود دریں بوستاں گلے
دُنیا پلے است رہگذارِ دارِ آخرت — اہلِ تمیز خانہ نگیرند بر پُلے

اے کہ آگاہ نۂ عالمِ درویشاں را — تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرست ایشاں را
گنجِ آزادگی و کنجِ قناعت ملکے ست — کہ بہ شمشیر میسر نشود سلطاں را
طلبِ منصبِ فانی نکند صاحبِ عقل — عاقل آن ست کہ اندیشہ کند پایاں را
جمع کردند و نہادند و بحسرت رفتند — وین چہ دارد کہ بحسرت نگزارد آں را
در ازل بود کہ پیمانِ محبت بستند — نشکنند مرد گرش سر برود پیماں را
عاشقے سوختۂ بے سروساماں دیدم — گفتم اے یار مکن در سرِ فکرت جاں را
نفسے سرد برآورد و ضعیف از سر زد — گفت بگذار من بے سروبے ساماں را
پندِ دلبندِ تو در گوشِ من آید ہیہات — من کہ بر درد حریصم چہ کنم درماں را
سعدیا عمر عزیز ست بہ غفلت مگذار — وقتِ فرصت نشود فوت مگرداں را

لاابالی چہ کند دفترِ دانائی را — طاقتِ وعظ نباشد سرِ سودائی را
دیدہ را فائدہ آں ست کہ دلبر بیند — ور نہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را
ہمہ دانند کہ من سبزۂ خط دارم دوست — نہ چو دیگر حیواں سبزۂ صحرائی را
سعدیا نوبتے امشب دہلِ صبح نکوفت — یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

شبے و شمعے و گویندہ خوبے زیبائے — ندارم از ہمہ عالم بجز ایں تمنّائے

فرشتہ رشک برد بر جمالِ مجلسِ من　　　گر التفات کند چوں تو مجلس آرائے
ضرورت است بلا دیدن و جفا بردن　　　ز دست آں کہ ندارد بحسن ہمتائے
قیامت است کہ در روزگار ما برخاست　　　بہ راستی کہ بلائیست آں قد بالائے
وگر چہ بینی اگر رو از و بگردانی　　　کہ نیست خوشتر از و در جہاں تماشائے
وگر کنی نظر از دور کن کہ نزدیک است　　　کہ سر ببازی اگر پیشتر نہی پائے
عالم کہ عارفاں را گوید نظر بدوزند　　　گر یار ما بہ بیند صاحب نظر بباشد
زیرا کہ بادشاہے چوں لقمۂ بگیرد　　　بنیادِ حلم اوّل زیر و زبر بباشد
دیوانہ را کہ گوئی ہشیار باش و عاقل　　　ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر بباشد
ساقی بیار جامے مطرب بگوے چیزے　　　لب بر دہانِ نے نہ تا نیشکر بباشد
بجز بے زلفِ تو با باد عیش ما دارم　　　اگر چہ عیب کنندم کہ باد پیمائے است
ترا ملامتِ سعدی حلال کے باشد　　　کہ بر کناری و او در میانِ دریائے است

الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشقِ مجازی کی طرف تھا اور عشقِ مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی ہیں بلکہ اکثر وہ عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق کیفیات و اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلبستگی کے زمانے میں ہر انسان پر گزرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے

کہ وصل کی اُمید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے :-

اے کہ گفتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست   گر اُمیدِ وصل باشد آں چناں دشوار نیست

یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزو کیا کرتے ہیں اور اس موقع کو یاد کر کے پچھتاتے ہیں جب کہ دلبستگی کے سامان اُنھوں نے خود مہیا کیے تھے۔ اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مُردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا۔ لیکن اُن کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جلن اور سوزش میں کس قدر لذت چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اگر بالفرض ترکِ عشق و محبت پر آپ کو اختیار دیدیا جاے تو وہ ہرگز اس دلبند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ شیخ نے کہا ہے :-

عندلیبِ عاشق گر بشکنی قفس را   از ذوقِ اندرونش پروائے در نباشد

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب تک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا مگر یہ بات بہت خیال میں گذرتی ہے کہ عشاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے، جیسا کہ شیخ کہتا ہے :-

دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست   تا نداند رقیباں کہ تو منظورِ منی

یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے مدت کے بعد جب ملاقات ہوتی ہے۔ تو وہ شکوہ اور شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے ملنے

کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یُوں بیان کیا ہے :-

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

غرضکہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل مُعرّا تھی۔ اوّل شیخ ہی نے ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوّف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذّت اور نمک اور دَرد بھر دیا۔ جن اُصول پر شیخ نے غزل کی بُنیاد رکھی تھی اُس کے بعد متغزلین نے وہی اُصول اختیار کیے۔ کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندوستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکہ جمایا کہ مذکورۂ بالا مُلکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا راگ رنگ سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے۔ سب جان و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، حال و قال کی مجلسوں میں، قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں، شعرا کی صحبتوں میں، مشائخ کے حلقوں میں، در و دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی +

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت وغیرہ کے مضامین نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس

بادۂ ہوش رُبا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مترتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلا شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اُسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ، امیر خسرو، امیر حسن سنجری، مولانا جامی، وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصّے میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان بزرگوار وں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف۔ اور سلوک اور تصوّف پر مبنی ہے لیکن اُس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جس طرح اُس سے ایک صوفی خدا پرست رُوحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اُسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اُس کے سُننے اور پڑھنے سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے عشقِ حقیقی کے ساتھ ہی عشقِ مجازی اور صورت پرستی و کامجوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت۔ علم و ہنر۔ نماز روزہ۔ حج و زکوٰۃ۔ زہد و تقوےٰ۔ غرضکہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر۔ مآل اندیشی۔ تمکین و وقار۔ ننگ و ناموس۔ جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ اور آوارگی رُسوائی۔ بدنامی۔ بدمستی۔ بے سرو سامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی

بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے - دولتِ دُنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا، توکل اور قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہرِ انسانیت کو خاک میں ملا دینا، دُنیا و ما فیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصوّر باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پُوچ اور حجابِ اکبر جاننا، حقائقِ اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رایگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مُطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لئے اُن کو لے اُڑتی ہے اور اُن کی تاثیر دہ چند بلکہ صد چند کر دیتی ہے اور جب باوجود اِن سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابرِ صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں - جن کی تمام عمر حقائق و معارف کے بیان کرنے میں گذری ہے - اور جن کا شعر شریعت کا لُبِّ لُباب اور طریقت کا رہنما اور عالمِ لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشیں ہوتے ہیں - پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو - اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر اِن اوصاف سے موصوف پاتے ہیں - جن کی اس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے - عشق بازی حُسن پرستی اُن کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولتمند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چسکا رکھتے ہیں - اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمّر لوگ بھی اُس کا دَم بھرتے ہیں - فضول خرچی ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا - توکل اور قناعت کے دھوکے میں

معاش کی فکر نہ کرنی غیر قوموں کی ترقی کا ذکر سُن کر دنیا و مافیہا کو ہیچ و پوچ بتانا عقل انسانی
کو حقائق اشیاء کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک لہو کا
سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقہ اور ہر درجہ کے
لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں
اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن
اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کے ترقی دینے
میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے ؀

مسیٹون صاحب نے جو کلکتہ ریویو مورخہ جون ۱۸۵۶ء میں خواجہ حافظ کا حال
لکھا ہے اُس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع
نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے
تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اسی
وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔
حافظ نے اُس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ وہاں چھوڑ دی
... اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آکر حافظ کو نہ پایا مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس نے
سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا۔
کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں۔ شیخ نے اُس سے ساری غزل پوری کرائی
اور جب وہ غزل سُنی تو اُس کو بددعا دی۔ کہ جو شخص تیری غزل پڑھیگا وہ عقل سے بیگانہ
رہیگا،، اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعی مسلمان اس بات
کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بددعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی کیونکہ اُس کے

ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "یہ حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے"، میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگا پیچھا ہے۔ قسطنطنیہ کے شیوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار واحرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اوباش والواط کو بے فکری۔ ناعاقبت اندیشی۔ عشق بازی۔ بدنامی رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانے کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے جب دولتمند اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حب جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اُس وقت البتہ یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو۔ اور اولوالعزمی کا تخم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دنیا سے اُن کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے اُس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشۂ جاہ دنیوی عروج پر تھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں میرے نزدیک اس سے مضر

کا اندیشہ ہے ؞

اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اِس سے اُن کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہے اُس سے لوگ متاثر ہوں۔ نہ یہ کہ اُس سے کبھی مضر نتائج پیدا نہ ہونے پائیں۔ بارُوت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں بااین ہمہ اُن کے موجدوں کی دانشمندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کریگی ؞

قصائد وغیرہ

اِس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے، مرثئے، ترجیع بند، مُلمع اور مثلث جمع کیے گئے ہیں یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اُس کی طبیعت ہی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گوں نہ تھی یا اُس نے مدح وستائش کے طریقۂ مروجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ مگر چونکہ اُس زمانے کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ اس لیے اُس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں ؞

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مدّاحی کی مسلمانوں میں تھی اُس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں۔ مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عباسی خلیفۂ بغداد کے زمانے سے شعرا کو نہایت گراں بہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مل جاتے تھے خلفا اور اُمرا کو اپنی تعریفیں سُننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ اُن کا مدّاح کسی اور

شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو اُن کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر تشبیب میں
زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعریف
میں خرچ کر دیتے ہیں صرف کچھ بچے کھچے خیالات ہمارے سر مارتے ہیں۔ ہزاروں علما و فضلا
نے قصیدہ گوئی اور مداحی کو اپنا پیشہ ٹھیرا لیا تھا۔ اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد
کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی
کرے شعرا تمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت
اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے۔ عباسیوں کے علاوہ فاطمی
دیلمی۔ کُردی۔ طاہری۔ صفّاری۔ سامانی۔ غزنوی۔ سلجوقی۔ خوارزم شاہی۔ وغیرہ تمام
سلسلوں میں مدّاحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی سامانیوں کے عہد سے
پہلے تو عربی قصائد کا ہی زور شور رہا۔ مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا
مدار زیادہ تر فارسی زبان پر ٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے خوب رواج پایا۔ ظہیر۔ رشید
خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں
متنبّی۔ ابو تمّام۔ بحتری اور ذو الرّمہ نے حاصل کی تھی +

اس بیان سے ظاہر ہے کہ شیخ سعدیؒ جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امرائے عہد کی
تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہوار میں نذر دکھانا
مگر قصیدے کی حالت اُس وقت ایسی بُری تھی کہ شیخ کو اپنی جبلّی استقامت اور سنجیدگی
کے سبب اُس روش پر چلنا دشوار تھا۔ ممدوح کی ستایش میں سراسر عقل و عادت کے
خلاف مبالغے کیے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی
تھی مسائلِ علمیہ اور مقدّمات علمیہ اور سلوک و تصوّف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی

اصطلاحیں اظہارِ علم و فضل کے لیے اُن میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں صنائعِ لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزادی و حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی ان تکلفات لایعنی سے مانع تھی اُس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے :۔

نہ کرسئ فلک نہد اندیشہ زیر پائے ۔۔۔ تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلان دہد

شیخ بوستاں میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریض کرتا ہے :۔

براہِ تکلف مرو سعدیا ۔۔۔ اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو ۔۔۔ تو حق گوے و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسئ آسماں ۔۔۔ نہی زیر پائے قزل ارسلاں
مگو پائے عزت بر افلاک نہ ۔۔۔ بگو روے اخلاص بر خاک نہ

اس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مداح پیشگی سے نفرت اور اعراض کیا ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ وہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اٹھاتا ہے اور کیوں اپنے کمالِ شاعری سے متمتع نہیں ہوتا؛ اگر مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازہ پر اپنا مطلب دریوزہ گردوں کی طرح لیجاؤں اگر ایک جو بھر تھر کے عوض میں کوئی مجھ کو سونا خزانے بخشش دے تو وہ مستحقِ شکر ہے اور میں قابلِ نفرین +

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغے اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی

داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کرکے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور
قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا اُس کے حاصل کرنے میں مقتضائے طبیعت
کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سُلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا تھا۔ اور اپنے دوستوں
کو اُس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ
قصیدے کو مقبولِ خاص و عام بنائے اور اِس ذریعے سے دربار میں تقرب حاصل
کرے جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اِس
خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریبوں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور
اُن میں جس قدر زیادہ مُبالغہ اور جھُوٹ کو کام فرمائیں اسی قدر گراں بہا صلے اور
انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیرؔ قزل ارسلان کے ہاں انوری سُلطان سنجر کے ہاں۔ رشید وطواط
خوارزم شاہ آتسز کے ہاں اور خاقانی شروان شاہ کے ہاں ملک الشعرا تھے۔ ان لوگوں
کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی تھی اور اُن کی ترقی اور تقرب کا
مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں۔ یہی
سبب ہے کہ قصیدے کے سوا کوئی بڑی یادگار اُنھوں نے نہیں چھوڑی ۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ
قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو ویسے جھُوٹے اور نمائشی طلسم باندھنے
کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں۔ اِسی لیے غلطی سے یہ
خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ مَیں ہرگز اِس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو
معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ میرے نزدیک جس طرح
رُول کو ٹیڑھا خط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ

نہیں چلنے دیتی۔ اِس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حدِ شاعری سے متجاوز ہوگیا ہے ایسی اور کوئی صنف نہیں ہوئی۔ مدحیہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سُنکر خاص و عام کے دل میں اُس کی محبت اور اُس کے ساتھ حُسنِ ظن پیدا ہو۔ اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے۔ اگر وہ صفتیں اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم اُن کو اُسی حال پر قایم رکھے اور اگر نہ ہوں تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے۔ یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہوسکتا ہے کہ جو صفات مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اُسی مدح کی وقعت ایک ہجوِ ملیح سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلاں کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ "تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کرلیتا ہے تب جاکر قزل ارسلاں کی رکاب پر بوسہ دیتا ہے"۔ اِس سے قزل ارسلاں کے دل پر سوا اِس کے کہ اُس کو ہجوِ ملیح سمجھتا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو مجد الدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ "اگر وہ زمانۂ گذشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانۂ آیندہ کی جگہ آجائے"۔ اِس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اِس کے کہ مدّاح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خاکہ اُڑا جاتا ہے اور کیا خیال گذرا ہوگا۔ یہی حال اُن تمام قصیدہ گویوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔ شیخ نے عدمِ قدرت کے سبب بلکہ فرطِ کراہت کے سبب مدح و ستایش کے اِس ناپسندیدہ طریقے کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اُسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بےتکلفی کے ساتھ جو کہ اُس کے کلام کی عام خاصیت ہے لکھے ہیں۔ اُس کے قصائد

سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے اُس نے اکثر قصیدے اور ترجیع وغیرہ محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلے و انعام کی اُمید پر۔ باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطینِ عہد اور حکامِ وقت کی شان میں لکھے ہیں۔ اُن کے اسلوبِ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے اہلِ دُنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدے کو اُن سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو اُس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نازکیے ہیں۔ اِن کے سوا اور قصیدوں میں اوّل مدح و ستایش کی چاٹ پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے +

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اُس کی علّتِ غائی جو اُس نے قرار دی تھی اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے +

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اُس کی رعایا میں سے تھا اُس کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے:۔

به نوبت اند ملوک اندریں سپنج سرائے — کنوں کہ نوبتِ تست اے ملک بعدل گرائے

چہ مایہ بر سرایں ملک سروراں بودند — چو دورِ عمر بسر شد درآمدند از پائے

نیاز بایدو طاعت نہ شوکت و ناموس — بلند بانگ چہ سود و میاں تہی چو درائے

بہ تیغ و نیزہ گرفتند جنگ جویاں ملک — تو بردہ بحر گرفتی بعدل و ہمّت و رائے

چو ہمت است چہ حاجت بہ گرز مغفر کوب — بہ جود دولت ست چہ حاجت بہ تیر جوشن خائے

عمل بیار کہ رخت سرائے آخرت است — نہ عود سوز بکار آیدت نہ عنبر سائے

هر آں کس است کہ بہ آزارِ خلق فرماید — عدوے مملکت است آں بہ کشتنش فرمائے
بکامِ دلِ دشمن نشیند آں مغرور — کہ بشنود سخنِ دشمنانِ دوست نمائے
دیارِ مشرق و مغرب بگیر و جنگ مجوئے — دلے بدست کن و زنگِ خاطرے بزدائے
نگویمت چو زباں آورانِ رنگ آمیز — کہ ابرِ مشک فشانی و بحرِ گوہر زائے
نگاہ آنچہ نوشتہ است عمر نفزاید — پس ایں چہ فائدہ گفتن کہ تا بحشر بپائے

دوسرے قصیدے میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے:-

بہیچ شیوہ درویش نیست تا گویم — کہ ہمچو بحرِ محیطی و ابرِ آذاری
نگویمت کہ بہ فضل از کرام ممتازی — نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
دگر چہ ایں ہمہ ہستی نصیحتِ اولیٰ تر — کہ پندِ راہِ خلاص است و دوستی یاری
بسعی کوش کہ ناگہ فراغتت نبود — کہ سر بخاری اگر روے شیر نر خاری
خداے یوسفِ صدیق را عزیز کرد — بخوبروئی و لیکن بخوب کرداری
شکوہِ لشکر و جاہ و جلال و مال ہست — ولے بکار نیاید بجز نکو کاری
بقاے مملکت اندر وجودِ یک حرف ست — کہ دست ہیچ قوی بر ضعیف نگماری
پس از گرفتنِ عالم چو کوچ خواہد بود — روا است گر ہمہ عالم گرفتہ بگذاری
بہ نیک و بد چو بباید گذشتنت بہتر — کہ نام نیک بدست آوری و بگذاری
ہزار سال نگویم بقاے عمرِ تو باد — کہ ایں مبالغہ دانم ز عقل نشماری
ہمیں سعادت و توفیق بر مزیدت باد — کہ حق گذاری و با حق کسے نیازاری

ملک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گذرا ہے

اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اُس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے :-

مراد سعدی از انشاد و زحمت خدمت — نصیحت است بہ سمع قبول شاہنشاہ

دوام دولت و آرام مملکت خواہی — ثبات راحت و امن فرید و رفعت و جاہ

کمر بطاعت و انصاف و عدل و عفو ببند — چو دست رحمت حق بر سرت نہادہ کلاہ

تو روشن آئینۂ زاہ درد مند بترس — عزیز من! کہ اثر مے کند در آئینہ آہ

معلم ابد آموز را سخن مشنو — کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خاں یعنی ہولاکو خاں یا اُس کے بیٹے اباقا خاں کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے مدحیہ اشعار کہہ کر لکھتا ہے :-

ہر نوبتے نظر بہ یکے مے کند سپہر — ہر مدتے زمین بہ یکے می دہد اماں

ہیچ نشاں کہ دولت باقیست بردہد — کایں عمر گاہ باغ بہارست و گہ خزاں

اے بادشاہ روئے زمین دور از آن تست — اندیشۂ تقلب دوراں کن و زماں

چوں کام جاوداں متصور نمی شود — خرم کسے کہ زندہ کند نام جاوداں

ناداں کہ بخل می کند و گنج مے نہد — مزدور دشمن ست تو بر دوستاں فشاں

یارب تو ہر چہ رائے صواب ست و فعل خیر — اندر دل وے افگن و بر دست وے براں

آہوے طبع بندہ چنیں مشک مید ہد — کز پارس مے برند بتاتار ارمغاں

سردار انکیانو جو خاندان اتابک کے زوال کے بعد سلطان اباقا خاں پسر ہلاکو خاں کے حکم سے فارس کا فرماں روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تاتاری مذہب پر نہایت پختگی سے ثابت قدم تھا۔ اُس کی شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے۔ ازاں جملہ ایک قصیدے میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھتا ہے :-

حرامش باد ملک و بادشاہی | کہ پیشش مدح گوییند از قفا ذم
عروس زشت زیبا کے تواں کرد | وگر بر خود کند دیبا ے معلم
اگر مردم ہمیں بالا و ریش اند | بہ نیزہ و نیز پر بستہ است پرچم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی | الا گر ہوشیاری بشنو از عم
چو یزداں نعمت کرم کرد مخصوص | چناں زی در میانِ خلق عالم
کہ گر وقتے مکانِ پادشاہیست | نباشد ۔ ہمچناں باشی مکرم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ | سخن ملکیست سعدی را مسلم
مقامات از دو بیروں نیست فردا | بہشتِ جاودانی یا جہنم

سلجوق شاہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس کی مدح کو ایک اور قصیدے اس طرح ختم کیا ہے :۔

جہاں نماند و آثارِ مملکت ماند | بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
کہ ملک و دولتِ ضحاک بیگنہ آزار | نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
خطاے بندہ نگیری کہ مہتران و ملوک | شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم
خنک کسے کہ پس از وے حدیثِ خیر کنند | کہ جز حدیث نمے ماند از بنی آدم

ان کے سوا جو قصیدے خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور ان کے بھائی خواجہ علاء الدین جوینی اور مجد الدین رومی اور فخر الدین ابوبکر وغیرہم کی مدح میں لکھے ہیں ان میں بھی مدح اکثر برائے نام ہے زیادہ تر نصیحت و پند سے اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں ان میں صرف نصائح و مواعظ یا فصلِ بہار کا سماں یا معشوق کی تعریف یا حمدِ الٰہی وغیرہ مندرج ہے ٭

ایک مختصر قصیدہ اوّل سے آخر تک بھی اِس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو ⁂

مدح و موعظہ مجد الدین رومی

جہاں بر آب نہادہ است و زندگی بر باد | غلامِ ہمتِ آنم کہ دل برو ننہاد
جہاں نماند و خرّم روانِ آدمیے | کہ باز ماند و زو در جہاں بہ نیکی یاد
سرائے دولتِ باقی نعیمِ آخرت است | زمینِ سخت نگہ کن چو مے نہی بنیاد
کہ دم ہمیش دریں بوستاں کہ باد اجل | ہمے بر آورد از بیخ قامتِ شمشاد
حیات عاریتی خانہ ایست در رہِ سیل | چراغ عمر نہادہ است بر دریچۂ باد
شبے بر آید و بے ما فرو شود خورشید | بہار گاہ خزاں باشد و گہے مرداد
بر آں چہ می گذرد دل منہ کہ دجلہ بسے | پس از خلیفہ بخواہد گذشت در بغداد
گرت ز دست بر آید چو نخل باش کریم | ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد
بسے بدیدۂ حسرت زمیں نگاہ کند | کسے کہ برگ قیامت ز پیش نفرستاد
وجودِ خلق بدل می کنند ورنہ زمیں | ہماں ولایتِ کیخسرو است و ملکِ قباد
چو طفل بر ہمہ بازید و بر ہمہ خندید | عجب تر آنکہ نگشتند دیگراں استاد
عروسِ ملک نکو روے دختریست ولے | وفا نمی کند ایں سست مہر با داماد
نہ خود سریر سلیماں بباد رفتے و بس | کہ ہر کجا کہ سریریست می رود بر باد
ہمیں نصیحتِ من گوش دار و نیکی کن | کہ وا نماند از ایشاں مگر بہ نیکی یاد
ندانست چشمِ بصیرت کہ گرد کردہ بخورد | بہیر زنگوے سعادت کہ صرف کرد و بداد

چناں کہ صاحبِ فرخندہ رائے مجد الدین — کہ بیخ اجر نشاند و بنائے خیر نہاد
نگویمت بہ تکلف فلانِ دولت و دیں — سپہرِ مجد و معانی جہانِ دانش و داد
تو آں برادرِ صاحب دلی کہ مادرِ دہر — بسا لہا چو تو فرزندِ نیک بخت نزاد
بروزگارِ تو ایّام دستِ فتنہ ببست — بیمنِ تو درِ اقبال بر جہاں بکشاد
دلیل آں کہ ترا از خدائے نیک آید — بس ست خلقِ جہاں را کہ از تو نیک افتاد
یکے دعا کنمت بے رعونت از سرِ صدق — خدات در نفسِ آخریں بیامرزاد
تو ہم زباں نکنی گر بصدق دل گوئی — کہ آفرینِ خدا بر روانِ سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد بن ابوبکر کے مرثیے میں لکھے ہیں، کلیات میں غلطی سے امیر فخر الدین ابو بکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں +

غریباں را دل از بہرِ تو خون ست — دلِ خویشاں نمے دانم کہ چون ست
عنانِ گریہ چوں شاید گرفتن — کہ از دستِ شکیبائی بروں ست
گر سلطان شہنشہ اندر قلبِ لشکر — نمے آید کہ رایت سرنگون ست
شکیبائی مجو از جانِ مہجور — کہ بار از طاقتِ مسکیں فزوں ست

---

۱۵۸ امیر فخر الدین ابوبکر اتابک ابوبکر کے امرائے نامدار میں سے تھا جو ادنیٰ درجے سے منصبِ بارسالار تک بہنچا تھا اور سعد ابوبکر اتابک کا بیٹا تھا جس زمانے میں ہلاکو خاں نے بغداد کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو اظہارِ دوستی و خیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا جب وہاں سے باعزاز تمام رخصت ہوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی جس سے اور دلی عہدوں کی طرح اس کو خوش ہونا چاہیے تھا؟ اس کو اس خبر سے ایسا صدمہ ہوا کہ راہ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور رستے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا۔ اس کی نعش جب شیراز میں آئی۔ تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے۔ جیسا ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اُس کا بیٹا اتابک محمد مظفر اُس کا جانشین ہوا +

سکون در آتشِ سوزنده گفتم — نشاید کرد - و درمان هم سکون ست
که دنیا صاحبے بد عهد و خوں خوار — زمانہ مادرے بے مهر و دون ست
نہ اکنوں است بر ما جورِ ایام — کہ از دورانِ آدم تا کنون ست
یکے دانم حدیثِ نامہ چون ست — ہمے بینم کہ عنوانش بخون ست
بزرگاں چشم و دل در انتظارند — عزیزاں وقت و ساعت می شمارند
غلاماں دُر و گوہر مے فشانند — کنیزاں دست و ساعد می نگارند
ملک خان سیاق و بردو ترخاں — بر ہوارانِ تازی بر سوارند
کہ شاہنشاہِ عادل سعدِ بوبکر — بہ ایوانِ شہنشاہی درآیند
حرم شادی کناں بر طاقِ ایواں — کہ مروارید بر تاجش ببارند
زمیں می گفت عیشے خوش گذاریم — ازاں پس آسماں گفت ار گذارند
امیدِ تاج و تخت خسروی بود — ازیں غافل کہ تابوتش درآرند
چہ شد پاکیزہ رویانِ حرم را — کہ بر سر کاہ و بر زیور غبارند
نشاید پارہ کردن زیور و وسے — کہ مردم تحتِ امر کردگارند
ولیکن با چنیں داغِ جگر سوز — ہمے شاید کہ فریادے ندارند
بلے شاید نہ مجبوراں بگریند — روا باشد کہ مظلوماں بزارند
ہمے دانم حدیثِ نامہ چون ست — ہمے بینم کہ عنوانش بخون ست
پس از مرگِ جواناں گل ممانا د — پس از گل در چمن بلبل مخواناد
کس اندر زندگانی قیمتِ دوست — نداند - کس چنیں قیمت مداناد
سر آمد روزگارِ سعدِ بوبکر — خداوندش بہ جنت در رساناد

به تلخی رفت از دنیاے شیریں | زلالِ کامِ او در حلقش چکاناد
جزاے مُردہ رفتن در غریبی | شراب اندستِ پیغمبر بستاناد
دریں گیتی مظفر شاہ عادل | محمّد نام بر دارش بماناد
سعادت پرتو نیکاں دہادش | بخیرے صالحاں نفسش پروراناد
روانِ سعد را با جانِ بوبکر | بہ اوجِ روح و راحت گستراناد
بکامِ دوستان و بختِ فیروز | بسے دَورانِ دیگر بگذراناد
نے دانم حدیثِ نامہ چون ست | ہمے بینم کہ عنوانش بخون است

صاحبیہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرق اشعار کا سَو صفحے کے قریب ہے۔ جس میں قطعہ۔ رباعی۔ فرد۔ ملمع۔ مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحب دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اِس لیے شیخ نے اِس مجموعے کا نام صاحبیہ رکھا ہے +

اِن اشعار میں کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے اشعار نصیحت و پند پر اور کسی قدر حُسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رُباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں +

قطعات

ناکساں را فزاستے ست عظیم | گرچہ تاریک طبع و بدخو یند
چو دو کس مشورت کنند بہم | گویداین عیب من ہمی گویند
سگکے شکایت با ایّام بایکے مے گفت | نہ بینیم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم

نه آشیانه چو مرغان نه غله چوں موران | قناعتست صفت و بُرد باری آئینم

گرم دهند خورم ورنه مے زدم آزاد | نه هم چو آدمیان خشمناک بنشینم

مرا نه برگ زمستان نه عیش تابستان | کفایت است همیں پوستین پارینم

نه در ریاضت و خلوت مقام می سازم | که جایگاه گلوخ ست و سنگ و بالینم

به لقمهٔ که تناول کنم ز دست کسے | روا است گر بزنند بعد ازاں به تر و بینم

چو گرسنه در نه گربایم ز دست مردم چیز | درو فتاده بود ریزه ریزه برچینم

بجاے من گر نشینند که در مقام صفا | برابرست گلستان و تل سرگینم

مرا که سیرت ازیں جنس و خوبی این صفت است | چه کرده ام که سزاوار سنگ و نفرینم

جواب داد که زیں بیش لعنت خویش مگو | که خیره گشت ز وصفت زبان تحسینم

همیں دو خصلت ملعون کفایت است ترا | غریب دشمن و مُردار خوارے بینم

نظر کردم به چشم راے و تدبیر | ندیدم به ز خاموشی خصالے

نگویم لب به بند و دیده بر دوز | ولیکن هر مقامے را مقالے

زمانے بحث علم و درس تنزیل | که باشد نفس انساں را کمالے

زمانے شعر و شطرنج و حکایات | که خاطر را بود دفع ملالے

خداے است آں که ذات بے مثالش | نه گردد هرگز از حالے بحالے

رحم الله یا معشر الماضین | که به مردی قدم سپردندے

راحت نفس بندگان خداے | راحت جان خود شمردندے

آں عزیزاں چو زنده می نشوند | کاش ایں ناکساں بمردندے

بس دست دعا بر آسمان بود | تا پاے برآمدست به سنگے

ای گرگ نگفتمت که روزی ؎ تا گه بسر افتدت پلنگی

ای طفل که دفع مگس از خود نتوانی ؎ هر چند که بالغ شدی آخر نه همانی

شکرانهٔ زور آوری روز جوانی ؎ آن ست که تدبیر پر پیر بدانی

صانع نقش بند بی مانند ؎ که همه نقش او نکو آید

رزق طائر نهاد در پر و بال ؎ که بهر طعمه فرو آید

روزی عنکبوت را به مگس ؎ پر دهد تا به نزد او آید

الحق امنای مال ایتام ؎ همچون تو حلال زاده یابند

هرگز زن و مرد کفر و اسلام ؎ نفس از تو پلیدتر نزایند

طفلان ترا پدر بمیراد ؎ تا جور وصی بیازمایند

اطفال عزیز ناز پرورد ؎ از دست تو دست برخایند

امیر ما عسل از دست خلق می نخورد ؎ که زهر در قدح انگبین تواند بود

عجب که در عسل از زهر می کند پرهیز ؎ حذر نمی کند از تیر آه زهر آلود

شنیدم که بیوه زنی دردمند ؎ همی گفت و رخ بر زمین می نهاد

هر آنکه خدا را که بر بیوه زن ؎ ترحم نباشد زنش بیوه باد

هر بد که بخود نمی پسندی ؎ با کس مکن ای برادر من

گر مادر خویش دوست داری ؎ دشنام مده بمادر من

مقابلت نکند با جسور پیشانی ؎ مگر کسی که تهور کند بنادانی

کس این خطا نپسندد که دفع دشمن خود ؎ توانی و نکنی یا کنی و نتوانی

شنیده ام که فقیهی به دهقانی گفت ؎ که هیچ خربزه داری رسیده گفت آری

ازیں حرف دو بہ دانگے - گر اختیار کنی / وزاں چہار بہ دانگے قیاس کن بارے

سوال کرد کہ چندیں تفاوت از پے چیست / کہ فرق نیست میانِ دو نوع بسیارے

بگفت ازاں چہ تو بینی حلال و ملکِ من ست / نیامدہ است بہ ستم بوجہِ آزارے

وزاں دگر پسرانم بغارت آوردند / حرام را نبود نزدِ شرع مقدارے

فقیہ گفت - حکایت دراز خواہی کرد / ازیں حرام ترت ہست صد بہ دینارے

تا سگاں را وجوہ پیدا نیست / مشفق و مہربانِ یک دگراند

لقمۂ درمیانِ شاں انداز / کہ ہمی گاو یک دگر بدرند

رباعیات

شب نیست کہ چشم آرزو مندِ تو نیست / ویں جاں بلب رسیدہ دربندِ تو نیست

گر تو دگرے بجاے من بگزینی / من عہدِ تو نشکنم کہ مانندِ تو نیست

ماہی اُمیدِ عمرم از شست برفت / بے فائدہ روزم چو شب بست برفت

عمرے کہ ازو دمے بجانے ارزد / افسوس کہ رایگانم از دست برفت

ازبس کہ بیازرد دلِ دشمن و دوست / گوئی بگناہ مسخ کردند شش پوست

وقتے غمِ او برہمہ دنیا بودے / اکنوں ہمہ غمہاے جہاں بر دلِ او ست

گویند ہواے فصلِ آذار خوش است / بوے گل و بانگِ مرغِ گلزار خوش است

ابریشمِ زیر و نالۂ زار خوش است / اے بے خبراں ایں ہمہ با یار خوش است

گویند مرو در پے آں سروِ بلند / انگشت نماے خلق بودن تا چند

بے فائدہ پندم مدہ اے دانشمند / من چوں نروم کہ مے برندم بکمند

آہو برہ را کہ شیر در پے باشد ○ بیچارہ چہ اعتماد بر وے باشد
ایں ملح در آب چند بتواند بود ○ ویں برف در آفتاب تا کے باشد

آں را کہ نظر بروے ہر کس باشد ○ در دیدۂ صاحب نظراں خس باشد
قاضی بہ دو شاہد بدہد فتوائے شرع ○ در مذہب عشق شاہدے بس باشد

مرداں ہمہ عمر بادہ بردوختہ اند ○ قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند
فردائے قیامت بگناہ ایشاں را ○ باشد کہ نسوزند کہ خود سوختہ اند

با دوست بگرمابہ درم خلوت بود ○ واں روئے گلینش گل حمام آلود
گفتا دگر ایں روئے کسے دارد دوست؟ ○ گفتم بہ گل آفتاب نتواں اندود

چوں صورت خویشتن در آئینہ بدید ○ واں کام و دہان و لب و دنداں بگزید
می گفت چنانکہ می توانست شنید ○ بس جاں بلب آمد کہ بدیں لب نرسید

امشب نہ پیام صبح روز بر مے آید ○ نہ نالۂ مرغان سحر مے آید
بیدار نشستہ ام نظر بر سر کوہ ○ تا صبح کے از سنگ بدر مے آید

وقت است کہ چشم فتنہ خوابش ببرد ○ باد از رخ گل حسن شبابش ببرد
گل وقت رسیدن آب عطار ببرد ○ عطار بوقت رفتن آبش ببرد

وقت گل روز شادمانی آمد ○ ہنگام نشاط و کامرانی آمد
آں شد کہ بہ سرما ناتوانی آمد ○ سرما شد و وقت مہربانی آمد

ما چاکر آں نسیم کہ دل برباید ○ یا دل بہ کسے دہد کہ جاں آساید
آں کس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کسست ○ در ملک خدا اگر نباشد شاید

آں گل کہ ہنوز نو بدست آمدہ بود ○ نشگفتہ تمام - باد مہرش بربود

خود را به مقام شیر می دانستم ○ چون خصم آمد بروبهی ماندستم
گفتم من و صبر اگر بود روز فراق ○ چون واقعه اوفتاد نتوانستم

شبها ز همه خلق نهان می گریم ○ چشم از غم دل بر آسمان می گریم
طفل از غم مرغ رفته چون گرید ○ بر عمر گذشته همچنان می گریم

چون ما و شما اقارب یکدگریم ○ به زان نبود که پردهٔ هم ندریم
ای خواجه تو عیب من مکن تا من نیز ○ عیب تو نگویم که یک از یک بتریم

گر بر رگ جان نشتر آید میرم ○ چه خوشتر از آنکه پیش دستت میرم
دل با تو خصومت آرزو می کندم ○ تا صلح کنی و در کنارت گیرم

ای آیت لطف و کرمت می بینم ○ وآسایش جان در قدمت می بینم
وآن وقت که غایبی همت می بینم ○ هر جا که نگه می کنمت می بینم

گفتم که دگر چشم به دلبر نکنم ○ صوفی شوم و گوش به منکر نکنم
دیدم که خلاف طبع موزون من است ○ توبت کردم که توبه دیگر نکنم

مه را ز فلک بطرف بام آوردن ○ وز روم کلیسیا بشام آوردن
در وقت سحر نماز شام آوردن ○ بتوان نتوان ترا بدام آوردن

نه سرو توان گفت نه خورشید نه ماه ○ آه از تو که در وصف نمی آئی آه
هر کس برهی می رود اندر طلبت ○ گر ره بتو بودی نزدی این همه راه

ای راهروان راهگذر از کوی تو نه ○ ما بی‌خبر از عشق و نگه سوی تو نه
هر تشنه که از دست تو بستاند آب ○ از دست تو سیر گردد از روی تو نه
ای یار کجائی که در آغوش نه ○ وامشب بر ما نشسته چون دوش نه

اے سروِ بلند و راحتِ جسم و دل ○ ہر چند کہ غایبی فراموش نۂ

اے کاج نگردے نگاہ از دیدہ ○ بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ

تقصیر ز دل بود گناہ از دیدہ ○ آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

روزے دو سہ شد کہ بندہ ننواختۂ ○ و اندیشہ بہ ذکرِ ما نہ پرداختۂ

زاں مے ترسم کہ دشمناں اندیشند ○ کز چشمِ عنایتم بینداختۂ

گفتم کہ کنم توبہ ز صاحب نظری ○ باشد کہ بلاے عشق گردد سپری

چنداں کہ نگہ مے کنم اے رشکِ پری ○ ہر روز ہمیں ز آولیں خوبتری

گویند کہ دوش شحنگانِ تتری ○ دزدے بگرفتند بصد حیلہ گری

امروز بہ آویختنش مے بردند ○ می گفت رہا کن کہ گریباں بدری

گیرم کہ بہ فتواے خردمندی و راے ○ از دائرۂ شرع بروں نہ نہم پاے

با میل کہ طبع مے کند چہ تواں کرد ○ عیبے ست کہ در من آفریدہ ست خداے

مفردات

دانی چہ گفتہ اند بنی عوف در عرب ○ نسلِ بریدہ بہ ز موالیدِ بے ادب

تو آتش بہ نے در زن و در گذر ○ کہ نہ خشک در بیشہ ماند نہ تر

مروت نباشد بر افتادہ زور ○ برد مرغ دوں دانہ از پیشِ مور

خواہی کہ بہ طبعت ہمہ کس دارد دوست ○ با ہر کہ در او فتی چناں باش کہ اوست

گر راہ نمائی ہمہ عالم راہ است ○ ور دست نگیری ہمہ عالم چاہ است

نہالے کہ ہر سال گردد درخت ○ ز بیخش بر آرد یکے باد سخت

اگر تو آب وی سرہنگاں ہم از درگہ براندت ازاں بہتر کہ در پہلوے مجہولے نشانندت

سلطاں چو بہ منزل گدایاں آید گر بر سر بوریا نشیند شاید

گر زہفت آسماں گزند آید ہمہ بر عضو درد مند آید

اگر دنداں نباشد ناں تواں خورد مصیبت آں بود کت ناں نباشد

منعم کہ نظر بحال درویش کند چنداں کہ کرم کند طمع بیش کند

تواضع گرچہ محمود است و فضل بیکراں دارد نشاید کرد بیش از حد کہ ہیبت را زیاں دارد

گفتم کہ بر آید آبے از چاہ امید افسوس کہ دلو نیز در چاہ افتاد

بشکر آں کہ تو در خانۂ واہلت پیش نظر دریغ مدار از مسافر درویش

کوتہ نظراں را نبود جز غم خویش صاحب نظراں را غم بیگانہ و خویش

گر بلندت کسے دہد دشنام بہ کہ ساکن دہی جواب سلام

بشنو کہ من نصیحت پیراں شنودہ ام بیش از تو خلق دیدہ و بیش از تو بودہ ام

از بہر دل کسے بدست آوردن مطبوع نباشد دگرے آزردن

چو بد گفتی مباش ایمن زبد گو کہ بد را کس نخواہد گفت نیکو

صاحب دل و نیک سیرت و علامہ گو کفش دریدہ باش و خلقاں جامہ

کرم بجاے فرو ماندگاں چو بتوانی مروت است نہ چندانکہ خود فرومانی

مردی نہ بقوت است و شمشیر زنی آن ست کہ ظلمے کہ توانی نکنی

تو با ما ہمہ شب بود باغ انسی خلاف است بیں کہ طول العہد منسی

پلپلے ملخے نزد سلیماں بردن عیب است و لیکن ہنر ست از مورے

من سخن راست گفتم تو اگر راست بخوانی جرم محتاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

توقلم کتبت لیبقے الذکر فی اُمم بعدی ٭ فیا ذاالجلال اغفر لکاتبہ السّعدی

مطائبات وہزلیات ومضحکات

شیخ کے کلّیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحے سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارضِ کمال پر ایک نہایت بدنما مسہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اُس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے۔ اِس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اِس حصّے میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بے باکی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ لُوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اُسی شخص کا ہے جس کے نتائجِ افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا ہی اُس کے انسان ہونے کی علامت ہے۔ اور اُس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور اُن کا ہمیشہ ایک ضابطے اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اُس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے ایک نادان بچّے کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصّہ آتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا۔ اور جب یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اُس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اِس مجموعے کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت

میں لکھی ہیں جو قابلِ لحاظ ہیں وہ لکھتا ہے :-

اَلْزَمَنِیْ بَعْضُ اَبْنَاءِ الْمُلُوْکِ اَنْ اُصَنِّفَ لَہٗ کِتَابًا فِی الْھَزْلِ عَلٰی طَرِیْقِ السُّوْزَنِیْ فَلَمْ اُجِبْہُ فَھَدَّدَنِیْ بِالْقَتْلِ فَلِاَجْلِ ذٰلِکَ اَجَبْتُ اَمْرَہٗ وَاَنْشَدْتُّ ھٰذِہِ الْاَبْیَاتَ وَاَنَا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ یعنی ایک بادشاہزادے نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں میں نے نہ مانا اس پر اُس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی - اس لیے اُس کا کہا مانا اور یہ اشعار لکھے اور میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں ؂

شیخ کا عذر جہاں تک ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا - تاتار سے لے کر روم و مصر و حبش تک اُس کی جولاں گاہ تھی - اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اُس کی زندگی ہی میں دُور دُور پہنچ گیا تھا - مسلمان امیرزادوں اور بادشاہوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تمسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی - پس اگر کسی نالائق بادشاہزادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سُن کر اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمیٔ صحبت کے لیے ایک مجموعہ ہزل و فحش موجود رہے - شیخ کو ان ہفوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو - تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے اور چونکہ اس مجموعے میں صریح فحش اور علانیہ پھکڑ کے سوا بامزہ اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیت ہے ، بہت کم پائے جاتے ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُمنگ اور طبیعت کی اُمنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں ؂

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورۂ غزنویہ کے شعرا سے برابر چلی آتی تھی۔ اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر ہاجی اور ہزال حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے اور اب تک ہوتے ہیں۔ جیسے حکیم انوری۔ حکیم خاقانی حکیم شفائی۔ حکیم قاآنی وغیرہ وغیرہ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے۔ اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورۂ بالا عبارت میں ہے۔ حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اُس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں اور حکیم سنائی نے بھی باوجود ہمہ مشیخت و تقدس تنگ آکر اُس کے جواب میں ایک ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعالی گنجوی جو منوچہر نوشیرواں شاہ کے عہد میں پایۂ تخت کا ملک الشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مُربّی اور خسر تھا اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجو بازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بُرائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مُبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس کا کہ وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے۔

ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوان شباب میں جو کہ شوخی اور بے باکی کا زمانہ ہے کسی توقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہو گی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں

شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا۔ مگر چونکہ وہ زمرۂ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا۔ اس لیے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکاً اور تیمناً کلیات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستاں کے مرتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ اس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے شیخ نے گلستاں میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں ⁕

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور قطعے اس مجموعہ میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں ⁕

رُباعیات

آں عہد بیاد داری و دولت و داد — کز عاشق بیچارہ نے کردی یاد
آنگہ بگریختی کہ کس چوں تو نبود — امروز بیامدی کہ کس چوں تو مباد

آں ماہ کہ گفتے مَلَکِ رحمان ست — ایں بار اگر ش نگہ کنی شیطان ست
رُوئے کہ چو آتش بزمستاں خوش بود — امروز چو پوستیں بتابستان ست

قطعات

چو خویشتن نتواند کہ مے خورد قاضی — ضرورت است کہ بر دیگراں بگیرد سخت
کہ گفت پیرہ زن از میوہ می کند پرہیز — دروغ گفت۔ کہ دستش نمی رسد بہ درخت

مردکے غرقہ بود درجیحوں | کز سمرقند بود پندارم
بانگ مے کرد و زار مے نالید | کاے دریغا کلاہ و دستارم
حریف عمر بسر بردہ در فسوق و فجور | بوقت مرگ پشیماں ہمی خورد سوگند
کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد | تو خود دگر نتوانی بریش خویش مخند

عربی قصائد اور مقطعات

کلّیاتِ شیخ میں بیس صفحے کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے سوا ملمّعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں۔ گلستاں میں بھی جیسا کہ اُس نے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظر اِس سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصّہ دیارِ عرب میں بسر ہُوا تھا اور عربی زبان بمنزلہ مادری زبان کے ہوگئی تھی۔ اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیلِ علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوّف اور علمِ ادب میں مصروف کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے۔ مگر جس قدر ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مشّاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیے بااین ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا ادّعا نہیں کرتا۔ چنانچہ بغداد کے مرثیے میں لکھتا ہے :-

وَ بِالشِّعرِ اَتْحُمُ اللّٰہِ لَسْتُ بِمُدَّعٍ | بخدا کہ میں شاعری کا دعوےٰ نہیں کرتا۔
وَلَوْ کَانَ عِنْدِیْ مَا بِبَابِلِ مِنْ سِحْرٍ | اگرچہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے جو بابل میں موجود تھا ؛

ھُنَالِكَ نَقَّادُوْنَ عِلْماً وَّ خِبْرَۃً | یہاں علم اور واقفیت کی رُو سے پرکھنے والے

ومُنتجِمنُوا القولَ الجمیلَ من الهجرِ — اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے چھانٹنے والے موجُود ہیں +

جرت عبراتی فوق خدّی کآبۃً — سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرے پر ٹپک پڑے

فانشأتُ ھذا فی قضیّۃِ ما جریٰ — سو میں نے یہ قصیدہ اِس سرگزشت کے بیان میں لکھ لیا +

ولو سبقتنی سادۃٌ جلّ قدرھم — اگر ذی رُتبہ لوگ اِس مضمون میں مجھ سے

لما حسُنتْ منّی مجاوزۃُ القدرِ — سبقت کرتے تو البتہ مجھ کو اپنے رُتبے سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا +

بہرحال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اُس سے شیخ کی شاعری کا رُتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہوگیا ہے۔ اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدے میں سے جو کہ اُس نے خرابئ بغداد پر لکھا ہے کچھ اشعار بطور نمونے کے اِس مقام پر نقل کرتے ہیں:-

حبستُ بجفنیّ المدامعَ لا تجری — میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو رُوکا تھا

فلمّا طغی الماءُ استطال علی السّکرِ — کہ بہنے نہ پائیں پر جب پانی نے طغیانی کی تو اُس بند کو توڑ ڈالا +

نسیمُ صبا بغداد بعدَ خرابھا — کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اُس کی

تمنّیتُ لو کانت تمرّ علی قبری — ہوا کا جھوکا میری قبر پر گزرتا +

لانّ ھلاکَ النفس عند اولی النُّھیٰ — کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مرجانا تنگدل

احبّ لھم من عیشِ منقبضِ الصدرِ — جینے سے بہتر ہے +

زَجرتُ طبیبًا حسّ نبضی مُداویًا
الیك فما شکوای من مرضٍ یُبری

میں نے طبیب کو جب کہ اُس نے علاج کے لیے میری نبض کو چھُوا۔ جھڑک دیا کہ جا اپنا کام کر مُجھ کو ایسے مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے ؛

لزمتُ اصطبارًا حیث کُنتُ مفارقًا
وھذا فراقٌ لا یُعالجُ بالصّبر

میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج صبر سے ممکن نہیں ؛

ولا تسئلونی عما جری یوم حصرھم
وذلك مما لیس یدخل فی حصر

نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں نہیں آسکتا ؛

ادیرت کؤوس الموت حتی کانّہ
رؤوس الاساری تحرکن من السکر

شراب مرگ کے جام گردش میں لائے گئے یہاں تک کہ قیدی کُشتوں کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جُنبش کر رہے ہیں ؛

بکت جُدُر المستنصریۃ نُدبۃً
علی العلماء الراسخین ذوی الحجر

علماے راسخین پر جو کہ اصحابِ عقل و دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں ؛

محابر تبکی بعدھم بسوادھا
وبعض قلوب الناس املأ من حبر

اُن کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے آنسوؤں سے رُوتی ہیں مگر بعض لوگوں کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں ؛

نوائب دھرٍ لیتنی متُّ قبلھا

یہ زمانے کے سخت حادثے ہیں کاش میں

وَلَمْ اَرَعَدْ وَانَ السَّفِیہِ علی الحبرِ — اُن سے پہلے مَر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانشمندوں پر نہ دیکھتا +

وَتُفَتُ بُعَبَّادَانَ اَرْقُبُ دِجْلَةً — مَیں نے شہر عبادان میں ٹھیر کر دجلے کے
کَمِثْلِ دمٍ قَانٍ تَسِیْلُ اِلَی الْبَحْرِ — پانی کو دیکھا کہ بکثرت خون کے مانند سمندر کی طرف بہتا تھا +

وَفَائِضُ دمعی فی مُصِیْبَةِ وَاسِطِ — میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں
یَزِیْدُ علی مدِّ البُحَیْرَةِ وَالجَزْرِ — جاری ہیں خلیج فارس کے مد و جزر کو اور بڑھا دیتے ہیں +

وَهَبْ اَنَّ دَارَ المُلْكِ تَرْجِعُ عَامِرًا — فرض کرو کہ دار الخلافہ پھر آباد ہو اور علماء کے
وَیُغْسَلُ وَجهُ العَارِفِیْنَ عَنِ العَفْرِ — چہرے غبار ذلت سے پاک کیے جائیں +
فَاَیْنَ بَنُو العَبَّاسِ مُفْتَخَرُ الوَرَىٰ — لیکن بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے
ذَوُو الخُلُقِ المَرْضِیِّ وَالغُرَرِ الزُّهْرِ — اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں کہاں سے آئینگی +

غَدَا سَمَرًا بَیْنَ الاَنَامِ حَدِیْثُهُمْ — اُن کا ذکر اب دُنیا میں ایک افسانہ ہو گیا اور
وَذَا سَمَرٌ یُدْمِی المَسَامِعَ کَالسُّمْرِ — یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے +

وَفِی الخَبَرِ المَرْوِیِّ دِیْنُ مُحَمَّدٍ — حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب
یَعُوْدُ غَرِیْبًا مِثْلَ مُبْتَدَاءِ الاَمْرِ — ہونے والا ہے جیسا کہ ابتداے حال میں وہ غریب تھا +

أأغرب من هذا ليوم فكما بدا | کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا
وشبى دار السلام فى ايدى الكفر | ہے کہ تمام دار الاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہو گیا +

أتذكر فى اعلى المنابر خطبة | کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائیگا اور مستعصم باللہ
ومستعصم بالله ليس فى الذكر | کا اُس میں ذکر نہ ہو گا +

ضفادع حول الماء تلعب فرحة | کیا اُس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے
اصبر على هذا ويونس فى القعر | اِدھر اُدھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو +

تحية مشتاق والف ترحم | مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں
على الشهداء الطاهرين من الوزر | اُن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے +
هنيئا لهم كاس المنية مترعا | موت کا لبالب پیالہ اور جو کچھ کہ اُس میں
وما فيه عند الله من عظم الاجر | خدا کی طرف سے اجرِ عظیم ہے اُن کو گوارا ہو جیو +

عليهم سلام الله فى كل ليلة | ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زوراء
بمقتل زوراء الى مطلع الفجر | کی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو +

وليت صماخى صم قبل استماعة | کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلّوں کے بے پردہ
بهتك استار المحارم فى الاسر | ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان بہرے ہو جاتے +

وكان صباح الاسر يوم قيامة
على امم شعث تساق الى الحشر

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ آتیں
سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر کی
طرف ہکائی جاتی تھیں ؎

ومستصرخ يا للمروة فانصروا
ومن يصرخ العصفور بين يدي صقر

بہت لوگ فریاد کرتے تھے کہ دہائی ہے مروت
کی کوئی مدد کرو۔ مگر باز کے پنجے میں چڑیا کی
فریاد کو کون پہنچتا ہے ؎

يساقون سوق المعز في كبد الفلا
عزائز قوم لا يعودون بالزجر

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کے عادی نہ تھے
اُن کے حریم محترم صحرا میں بکریوں کی طرح
ہکائے جاتے تھے ؎

جلبن سبايا مسافرات وجوهها
كواعب لا تبرزن من حلل الخدر

جو لڑکیاں پردے میں چادروں سے چہرے
باہر نہ نکالتی تھیں اُن کو کھلے منہ اسیر کر کے
لے گئے ؎

تقوم وتخفو في المعاجر والملوى
وهل يختفي مشي النواعم في الوعر

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور ٹیلوں کی
ڈھلانوں میں منہ چھپاتی ہیں مگر اُن کٹھن
رستوں میں نازنینوں کی چال کب
چھپ سکتی ہے ؎

لقد كان فكري قبل ذلك ما ترى
فما حدث امر الا يحيط به فكري

اس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تو جانتا ہے
مگر ایک ایسا امر عظیم حادث ہوا جو میرے
فکر کے احاطے سے باہر ہے ؎

وَبَینَ یَدَی صرفُ الزمانِ وحُکمِہٖ
مُغلّلۃٌ ایدِی القیاصرۃِ الجَبر

زمانے کی گردش اور حکومت کے سامنے شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں *

نعوذ بعفوِ اللہِ مِن نارِ فتنۃٍ
تأجّجَ مِن قُطرِ البلادِ اِلی القُطرِ

خدا کی پناہ ہے فتنے کی اُس آگ سے جو دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب تک بھڑکتی چلی گئی *

بدا و تعالی مِن خُراسانَ قسطلٌ
فعادرکاما لایزولُ عن البدرِ

خراسان سے ایک غبار نمودار ہو کر بلند ہوا اور ایک گھنگھور گھٹا بن گئی جو چاند پر سے ہٹنے والی نہ تھی *

دَعَی اللہُ اِنساناً تیقّظ بعدھم
لِاَنّ مصابَ لزیدٍ مزجرۃُ العمرِو

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولت بنی عباس کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے *

وَسائرُ ملکٍ یقتفیہِ زوالُہٗ
سِوی ملکوتِ القائمِ الصمدِ الوِترِ

خدائے بے نیاز و یگانہ کے مُلک کے سوا ہر مُلک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا زوال لگا ہوا ہے *

اِذا کانَ بعدَ الموتِ لافرقَ بیننا
فلا تنظُرنّ الناسَ بالنظرِ الشزرِ

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی نگاہ سے مت دیکھو *

وَجَارِيَةُ الدُّنْيَا نُعُومَةُ كَفِّهَا
مُحَسَّنَةٌ لٰكِنَّهَا الْكَلْبُ ذُو الظُّفُرِ

آئینے کی طرح معشوقۂ دنیا کی ہتھیلیاں تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اُس کے ناخن تیز ہیں ❊

وَلَوْ اَنَّ ذَا مَالٍ مِنَ الْمَوْتِ خَالِيًا
لَكَانَ جَدِيرًا بِالتَّعَاظُمِ وَالْكِبْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا تو البتّہ بڑائی اور تکبّر کرنے کا مستحق تھا ❊

رَبِحْتَ الْهُدٰى اِنْ كُنْتَ عَامِلَ صَالِحٍ
وَاِنْ لَمْ تَكُنْ وَالْعَصْرِ اِنَّكَ لَفِي خُسْرٍ

اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع اُٹھالیا ورنہ کچھ شک نہیں کہ ٹوٹے میں رہا ❊

عَلَى الْمَرْءِ عَارٌ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدَهُ
وَاِنَّكَ يَا مَغْرُورُ تَجْمَعُ لِلْفَخْرِ

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی کے لیے ننگ کی بات ہے مگر اے غافل تو اُلٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا ہے ❊

عَفَا اللّٰهُ عَنَّا مَا مَضٰى مِنْ جَرِيمَةٍ
وَمَنَّ عَلَيْنَا بِالْجَمِيلِ مِنَ السَّتْرِ

خدا اے تعالےٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر ہم پر احسان کرے ❊

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے توسے کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی ۔

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنےٰ درجے کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی ۔

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشیع کا گمان کیا گیا ہے اُس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعی لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دیکر ایک ایسے شخص کو جو مقبولِ فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ

بے تعصّب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے *

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہلِ باطن و صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اِس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا۔ مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلّف۔ کھلا ڈلا یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دُور سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازمِ بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر، رشید، قاآنی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کی بھٹئی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ باآنہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا۔ اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبّت سے اُس کی نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ امیروں سے وہ اِس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُسکی سفارش سے جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔ خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے

قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدائے تعالےٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اِس قدر مقبول نہ ہوتے، اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چُوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس میں دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جوہر فطری۔ دوسرے زمانے کے ایسے اتفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیّت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطّہ تھا جہاں ہونہار بچّوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رُشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسے میں وہ حسنِ اتفاق سے تحصیل کے لیے پہنچا وہ تمام مدارسِ اسلامیّہ میں ممتاز اور سر برآوردہ تھا۔ اور جس دار الخلافہ میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شایستہ اور مہذّب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانے نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دور و دراز سفر کرنے اور دُنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے

پے درپے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم
عاملوں کے ظلم وستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت
میں راسخ ہوگئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے
ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اس کے روبرو ایسا انقلاب
ہُوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور رُوستازادے وزارت کے درجے
کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل وہوش کے ساتھ اُس نے
اکیانویں برس بسر کیے تھے۔ عجیب وغریب تماشے اُس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطینِ
کردیہ کا خاندان جن کی سطوت وجلالت، ایشیا۔ افریقہ اور یورپ میں یکساں
مانی جاتی تھی اِسی صدی میں تمام ہُوا۔ سلاجقۂ قونیہ اور خوارزم شاہیوں کی
نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کردیا۔ اِسی صدی میں
ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریاے
سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِسی صدی میں تاتاریوں[1] کے ہاتھ
سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ
کے لیے نیست ونابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون
مغلوں کی تلوار سے دجلے کے ریتے میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا

---

[1] اِس معرکے میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے دیباچے میں لکھا ہے تاتاریوں نے صرف
رَے اور اُس کے گرد ونواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے۔ اور خراسان
کے چار شہر بلخ۔ مرو۔ ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہوگئے اور اُن کے داہنے بائیں اکثر
بستیاں قتل وغارت کا نشانہ ہوئیں ٭

ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب وصاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اِسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا۔ دار الملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقۂ اسمٰعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا اِن کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردولا نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کرسکتا ہے چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے اُس میں کہتا ہے ؎

رَعَی اللّٰهُ اِنسَاناً تَیَقَّظَ بَعدَهُم ۔۔۔ لِاَنَّ مُصَابَ اَلزَّیدِ مَزجَرَةُ العَمرِو

یعنی خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہوگیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے ÷

یوروپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ مَیں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرمجوش اور دلسوز اُستاد تھے ÷

اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسر آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالے[1] میں اُس کے فحوائے بیان سے معلوم

---

[1] یہ رسالہ شیخ کے کلیات میں شامل ہے ÷

ہوتا ہے یہ تھی کہ عالمِ سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما۔ صلحا۔ مشائخ اور کاملین سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے بکثرت سے دانشمندوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بوستاں میں کہتا ہے ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری تک جس تک کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل وکمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے لیکن پھر بھی بلادِ اسلام میں ایک جمِ غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علما وحکما کا نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد ورفت رہی ہے جیسے ایران روم۔ شام۔ عراق۔ عرب اور مصر وغیرہ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے۔ ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا۔ اُن میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق ایسے موجود تھے جو تمام بلادِ اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین ابن العربی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی۔ شیخ صدر الدین قونوی۔ مولانا جلال الدین رومی۔ ابن تیمیہ حرانی۔ امام یافعی۔ شیخ ابوالحسن شاذلی۔ شیخ تاج الدین قسطلانی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ ابن فارض۔ شیخ اوحد الدین کرمانی۔ قاضی ابن خلکان۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح۔ خواجہ علاء الدین سمنانی۔ علامہ قطب الدین شیرازی۔ امام محی الدین نووی۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی۔ ابن عساکر

فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے سینکڑوں جلیل القدر علما اور مشائخ شیخ کی نظر سے
گزرے تھے ۔ اور ان کے علاوہ جیساکہ گلستاں اور بوستاں سے ثابت ہوتا ہے
وہ ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل
کرتا تھا۔ جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔
اسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک
ہوتا تھا۔ کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا۔
اور کبھی اوباش و الواط کے جلسوں کا تماشائی تھا۔ نہ اس کو شراب خانے
میں جانے سے عار تھا نہ بت خانے میں رہنے سے تنگ تھا۔ اسی نے
جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا۔ اور وہی بت خانۂ سومنات میں ایک
مدت تک پجاری رہا۔ کبھی وہ بصرے کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ
کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا
پھرتا تھا۔ غرضکہ اس کی تمام عمر خصائلِ انسانی اور نیرنگیے روزگار کے
مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اس کو
گریٹ مورلسٹ کہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی
کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر
سے نہیں کھنچ سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعرائے ایران میں جس قدر
عمر شیخ نے پائی ہے ظاہرا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری
تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اس نے ایک سو بیس برس اس قفسِ عنصری میں
بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی

ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڑھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے اگرچہ شیخ خنت کے مرتبے کو پہنچکر شاعر کی فکر میں بلند پردازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ اُن کی قابلیت و استعداد اعلےٰ درجے کی تھی مگر اُن کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "غنچۂ استعدادش ناشگفتہ ماند" ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال نخوت اور بلند پردازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اَلھڑ بچھیرا جس کی باگ ڈور اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے۔ اور ایک معمّر سن رسیدہ شاعر گو اُس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اُس شایستہ اور رسُدہ منی گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا۔ الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدا تعالےٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔

شاعری کی بُنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعیہ پر نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام کے خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالا پن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے

تو دائرہ شاعری سے خارج ہو گا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون
پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اُس مضمون کا جوش اور وَلولہ موجود ہونا چاہیے ورنہ
شعر نہایت کمزور ہو گا۔ یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پُوری پُوری
پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائینگی۔ اگرچہ
بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت
محدود اور ایک خاص صفت میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی کی غزل اسلیے
ہم اُن کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے ۔

شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بھی بہت بڑی فوقیت ہے کہ اُس کی نظم و
نثر دونوں مسلّم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہو گی کہ ایران میں جتنے
مسلّم الثبوت شعرا گزرے ہیں اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے
جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندوستان میں مُلا نورالدین
ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں۔ لیکن اہلِ ایران اُس کی نظم و نثر
دونوں کو ناپسند کرتے ہیں بے شک اُس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر
میں نہایت دلفریب ہیں جیسے ۔

سنبل حرمش از آہ تا شکیباں   بنفشہ منقطہ اش از خالِ دلفریباں

ز رشحِ طراوتِ کلمات بہر سطر ش لالہ آبحیات خضر تشنہ لب سیرابی ادا نسیما مُردہ
جاں بخشی ہوا انگندہ ہائے برجستہ غنچہ ہائے سربستہ نثرش نثرہ رفعت شعرش شعرٰی
مرتبت سپہر صفحہ چمنے و ہر سطرے تختے پر گلش لفظ دلکش و بارش معنی بے غش و ہجر خوش
شعلے و ہر فرش اصلے اسی طرح سہ نثر کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت

خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ع

خوب اند و خوش اند و بو ندارند

بخلاف اس کے شیخ نے گلستاں میں اس سے بہت زیادہ دلاویز و دلکش الفاظ میں حقائق واقعیہ کو بیان کیا ہے یہ بات گلستاں کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔

"در ایام جوانی چنانکہ افتد و دانی۔ نظرے داشتم بر روئے و گذرے داشتم بکوئے۔ ۲۔ اے برادر حرم در پیش و حرامیاں از پس اگر رفتی بردی و اگر خفتی مردی۔ ۳۔ آنکہ در دل دوستاں جہل است و کفارہ ذنبیں سہل ۴۔ تو کہ چراغ نہ بینی بچراغ چہ بینی۔ ۵۔ طریق درویشاں ذکر است و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ بدیں صفتہا موصوف است بحقیقت درویش است۔ اگرچہ در قباست۔ امّا ہرزہ گرے بے نمازے ہوا پرستے ہوس بازے کہ روزہا بہ شب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب غفلت و بخورد ہرچہ در میان آید و بگوید آنچہ بر زبان آید زندیق است اگرچہ در عباست۔ ۶۔ پدر را عسل بسیار است امّا پسر گرمی دار است۔ ۷۔ صیاد بے روزی در دجلہ ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد۔ ۸۔ گوئی خردہ مینا بر خاکش ریختہ و عقد ثریا از تاکش در آویختہ۔ ۹۔ عصارۂ تاکی بہ قدرت شہد فائق شدہ و تخم خرما بہ تربیتش نخل باسق گشتہ۔"

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں شاذو نادر ہوئے ہیں بلکہ ہر ایک زبان میں یہی حال ہے۔ انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے۔

صرف گنتی کے آدمی ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہلِ فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے بعضے ملٹن کو اور بعضے سکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں - پس شیخ کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر دونوں ایسی ہیں جن کو اہلِ زبان نے تسلیم کیا ہے :-

شیخ نے بھی تغزّل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعراے ایران کی طرح اَمردوں اور سادہ رخوں کے عشق ہی پر رکھی ہے - لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اِس بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر اَمرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے - فارسی زبان میں اور اُس کی پیروی سے اردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت - رند ہو یا صوفی - خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا - مرد کا عاشق ہو یا عورت کا - بلکہ سِرے سے عاشق ہو یا نہ ہو - ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُسکا معشوق دونوں مرد ہیں - اِسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت - دنیادار ہو یا تارک الدنیا - عشقِ حقیقی رکھتا ہو یا عشقِ مجازی - مرد کا عاشق ہو یا عورت کا - ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے - اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق

کو مرد اور کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑیگا - حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی غزلوں سے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رخ لڑکے پر مفتوں ہیں اور اُن کے ہندی دوہڑوں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے - اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطر و بے قرار ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقت واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے - جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنھوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بو سونگھی - صدہا شعر شراب و کباب کے مضموں کے لکھتے ہیں - اسی طرح ہزاروں پاک باز اور صاحب عفت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں - البتہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے جس کے اُصول اور فروع سب تصنع اور بناوٹ اور ادعائے محض پر مبنی ہیں - لیکن شیخ سعدی اور مولینا رُوم اور امیر خسرو اور خواجہ حافظ اور اور تمام شعرائے متصوفین اس سے مستثنےٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرایہ میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعیہ بیان کرتے ہیں - بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاہد کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اُس سے شاہد حقیقی کے شیون و صفات مراد لینی صرف ایک مُلّایانہ گھڑت ہے جس میں سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے - مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچۂ شاعری سے نابلد ہیں - کنایہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر

ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

شعرائے متصوفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو اُن میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیاتِ متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے اُن کے سامنے کسی نے اُن کے معاصر شیخ کمال اسمٰعیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا ؎

چشم اگر این ست وابرو این وناز وعشوہ ایں الوداع اے زہد وتقوے الفراق اے عقل ودیں

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضرور ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محمل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سُنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مرادف لفظ ہیں۔ پس عین سے ذاتِ الٰہی مراد لی جا سکتی ہے۔ اور ابرو حاجب کا مرادف ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفاتِ الٰہی جو کہ حاجب ذات ہیں مُراد لیے ہیں۔ مولانا نے اِس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی۔ خواجہ حافظ کی نسبت اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان الاسرار ہے۔ اُس نے اکثر اسرارِ غیبی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکتا۔" پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوانِ حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی سے

تتبع سے حاصل کیا ہے ؂

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُنھوں نے تغزّل کی بنیاد
اَمرد پرستی پر کیوں رکھی ہے - عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو
عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ دونوں طریقے
نیچر کے مطابق ہیں - مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب
اور کا نجو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرتِ
انسانی بالکل اِبا کرتی ہے - ہمارے نزدیک اِس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی
زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے - اُس میں
ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی
ہیں - پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت
اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں - لیکن اِس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور
ضمائر یا افعال وغیرہ سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے
یا عورت - رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق اور معشوق دونوں مرد
فرض کیے جاتے ہیں - میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے
تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شُبہ باقی رہ جاتا ہے -
اِس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر
اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اِس کے کہ اُن کے ہاں عورتوں کو مردوں سے
چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا - غیر قوموں کے میل جُول سے عورتوں کے باب
میں اُن کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی - خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں

اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسیسی جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا ہے اپنے وقائع سفر میں لکھتا ہے "ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی متنفس اگرچہ کیسا ہی ذی رتبہ اور صاحبِ اعتبار ہو نہیں جانے پاتا تھا۔ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا"۔ اور ایران میں سُنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھ فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا گاؤں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے"۔ شاید اس بیان میں کچھ مُبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مداح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے طبع کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرا نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حُسن و جمال کا ذکر اور جو جو معاملات عشق کے زمانے میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں اُن کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی حمیت اور غیرت کے برخلاف سمجھا ہو۔ اور اس لئے تمام عشقیہ مضامین امردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطینِ مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی غزل گا رہا تھا اور بادشاہ اُس کو سُن کر بہت محظوظ

درہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا ؎

تو شبانہ مے نمائی بہ برِ کہ بودی امشب کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ دفعتہً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اِس قدر برہم ہُوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور مُلّا نقشی مُہرکن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بُلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیما کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا ہُوا پایا۔ عرض کیا۔ حضور خیر باشد! بادشاہ نے کہا دیکھو! امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟۔ مُلّا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کردیا۔ اُنھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشو و نما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی اُنھوں نے اُسی طریقے پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی اور عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشے یا نیند کا خُمار پایا جاتا ہے"۔ یہ سُن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بجانا ہونے لگا ؂

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُن کی اَمرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستاں کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اُس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں اُس کو سادہ رُخوں اور اَمردوں کی طرف میلانِ خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو

یں کسی بُرے معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو نفحات وغیرہ میں لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشقِ مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو۔ سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقیِ باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عُرفا میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفّت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی برأت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے ؎

گو نظرِ صدق را نام گنہ مے نہند
حاصلِ بازیچ نیست جز گُنہ اندوختن

تمّت بالخیر